قیمت: 10/- روپے

اپریل 2010

اردو دنیا

قومی اردو کونسل کی جانب سے منعقد جلسہ تقسیم اسناد بہ اشتراک علامہ فضل حق خیرآبادی ایجوکیشنل سوسائٹی، کانپور میں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ اور محترمہ ڈاکٹر انیتا بھٹناگر جین (جوائنٹ سکریٹری وزارت ترقی انسانی وسائل محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند) کے علاوہ جناب عبدالمطلب صدر علامہ فضل حق خیرآبادی ایجوکیشنل سوسائٹی، شہر قاضی اور خان احمد فاروق کو بھی دیکھا جاسکتا ہے۔

اس موقع پر محترمہ ڈاکٹر انیتا بھٹناگر جین، طالبات کو اسناد اور شیلڈ دیتے ہوئے۔ ساتھ میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ اور جناب عبدالمطلب کو بھی دیکھا جاسکتا ہے۔

اردو دنیا

قومی اردو کونسل کا ماہانہ رسالہ

جلد-12، شمارہ-4، اپریل 2010

مدیر: ڈاکٹر محمد حمیداللہ بھٹ

ناشر اور طابع:
ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

کمپوزنگ: شہناز اختر

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا، فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت -/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں۔

صدر دفتر:
ویسٹ بلاک-1، ونگ-6
آر. کے. پورم، نئی دہلی- 066 110
فون: 26103381, 26103938
26179657 فیکس: 26108159
ویب سائٹ:
http://www urducouncil.nic.in
email: urduduniyancpul@yahoo.co.in
urducouncil@gmail.com

شعبۂ فروخت:
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7،
آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066
فون: 26109746, 26169416

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس،
بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002
فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

آپ کی بات .... قارئین کے خطوط 2
ہماری بات .... ادارہ 7

گوشۂ مخمور سعیدی

- سوانحی خاکہ .... توقیر راہی 8
- ایک نظم مخمور سعیدی کے لیے .... چندر بھان خیال 9
- مفکرانہ لہجہ اور استعاراتی کیفیت .... شمس الرحمن فاروقی 10
- ذہن کا سفر .... رشید حسن خاں 12
- بھیڑ میں اکیلا .... شین کاف نظام 19
- ایسا کہاں سے لاؤں .... فضل الرزاق خاں ارشد 26
- اردو شعر و ادب کا اہم ستون تھے: مخمور سعیدی .... فاروق ارگلی 28
- خالی کرسی .... آبگینہ نظر 30
- مخمور بھائی... آپ سن رہے ہیں؟ .... نصرت ظہیر 32

زبان، ادب اور تعلیم

- اقبال کی نوائے شوق .... حامدی کاشمیری 34
- جمہوری اقدار اور ہمارا ادب .... انور پاشا 37

صحت اور ٹیکنالوجی

- Dyslexia کیا ہے؟ .... وحید الحق 41

کیریئر

- ہندستان کے بعض ووکیشنل کورسز .... ایم نسیم اعظمی 44

ہماری مطبوعات سے

- عربی زبان .... عبدالحلیم ندوی 46
- تصور اور حقیقت .... حبیب حق 53

اردو خبرنامہ .... ادارہ 57

تبصرہ و تعارف 73

- آزادی کے بعد اردو اسٹیج ڈرامے .... ابوظہیر ربانی
- ہند—ایرانی ادبیات (چند مطالعے) .... غافل انصاری
- فکر و تحقیق (سہ ماہی) .... عبدالحق کمال
- فلک پہلو میں (شعری مجموعہ) .... احمد نفیل
- نئے تنقیدی مسائل اور امکانات .... رغبت شمیم
- راجستھان میں اردو نثر کی ایک صدی (1857 سے 1957 تک) .... وسیم اقبال

بچوں کا گوشہ

- بی بی مینڈ کی کوز کام .... نذیر احمد یوسفی 80

آپ کی بات

■ عبدالباری وسیم، اڈیٹر ماہنامہ "ھلال"، رام پور

قومی اردو کونسل کو ایک بار پھر آپ کی سربراہی مبارک ہو۔ یہ بات ظاہر ہے کہ آپ کی ڈائرکٹرشپ سے پہلے قومی اردو کونسل ایک گمنام ادارہ تھا۔ آپ نے اپنی بے مثل اردو دوستی اور قابل تقلید صلاحیتوں سے اس کو ایک عالم سے روشناس کیا۔ 2005 میں آپ کو اپنی بلند حوصلگی اور ناقابل شکست عزائم کے سبب سخت آزمائش سے گزرنا پڑا اور پھر کچھ عرصے بعد قومی اردو کونسل آپ کی سرپرستی سے محروم ہوگئی۔

2006 میں کلکتہ میں قومی اردو کونسل کی جانب سے آپ کی غیر موجودگی میں پہلی بار "اردو کتاب میلے" کا انعقاد ہوا۔ راقم الحروف خود اس میں شریک تھا۔ میلے میں بھیڑ بھی تھی، ہنگامے بھی لیکن راقم نے اس میلے میں قومی اردو کونسل کے محسن اور کتاب میلے کے بانی کی غیر موجودگی کے سبب عجب سی تشنگی اور ویرانی محسوس کی۔ راقم کی نظر میں مذکورہ اردو کتاب میلہ ناکام اور تشنہ تھا۔ اس کے بعد بھی چند کتاب میلے ہوئے جو مذکورہ بالا میلے سے مختلف نہ تھے۔ 2009 میں آپ کے بلند عزائم اور کردار کی سچائی نے ایک بار پھر آپ کو قومی اردو کونسل کا سرپرست بنا دیا۔ یہ نہ صرف قومی اردو کونسل کی خوش نصیبی ہے بلکہ تمام اردو داں طبقے کے لیے باعثِ فخر ہے۔ آپ کی مبارک آمد پر یہ پہلا کتاب میلہ انشاء اللہ کامیاب بلکہ کامیاب ترین ثابت ہوگا۔ آپ کو صدقِ دل سے صد ہا مبارکباد۔ نیا سال 2010 آپ کے حق میں قدم قدم کامرانیوں اور شادمانیوں کا ضامن ہو۔

■ ایم۔ راگھوراؤ، ساؤتھ سول لائنز، چھندواڑا، مدھیہ پردیش

جنوری 2010 کا شمارہ وقت پر ملا، شکریہ۔ آپ سبھی کو نیا سال مبارک، رسالے کے سرورق پر چھپی فروغ اردو بھون کی تصویر دیکھ کر طبیعت خوش ہوگئی۔

"آپ کی بات" کالم میں جو خطوط شامل ہوتے ہیں ان سے قارئین کا نقطۂ نظر معلوم ہوتا ہے اور رسالے میں شامل مشمولات و نگارشات پر تجزیہ ملتا ہے۔ سید فضل کا مضمون پسند آیا۔ محمد افروز عالم نے صحیح فرمایا ہے کہ تعلیمی نظام میں نفسیات کا مقام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ جذباتی ذہانت ایک جدید تصور ہے۔ فیروز بخت احمد نے اپنے مضمون کے ذریعے اردو والوں کو بتایا ہے کہ جو لوگ اپنی زبانوں کی ترقی کے لیے محنت نہیں کرتے وہ زبانیں تاریخ کا حصہ بن جاتی ہیں۔

خبرنامے سے اردو زبان و ادب میں کہاں کیا ہو رہا ہے اس کی معلومات حاصل ہوتی رہتی ہے، آج کی نسل اردو رسم الخط سے نابلد ہے، آج کی شعر و شاعری بھی بے جان ہے "اردو خبرنامے" سے معلوم ہوا کہ اگنو نے اردو کورس شروع کیا ہے۔ اردو سیکھنے والوں کے لیے یہ سہولت فائدہ مند ثابت ہوگی۔

"زبانیں تہذیبوں کا چہرہ ہوتی ہیں اور وہ کسی سرحد میں قید نہیں ہوتی۔ اردو ایک ایسا درخت ہے جس کا سایہ ہندوستان اور پاکستان دونوں پر ہے۔ ادیب اور شاعر امن کے پیمبر ہوتے ہیں۔ ادب تنگ نظری یا جنگ کی دعوت نہیں دیتا" گوپی چند نارنگ کے یہ خیالات خبرنامے میں پڑھنے کو ملے۔ رسالے میں شائع شدہ تبصرے بے حد اہم ہیں ابرار احمد اعظمی کی کہانی "ہاتھی کا مشورہ"، بیکل اتساہی وفروغ ردہوی کی نظمیں بہت اچھی لگیں۔

■ شاغل ادیب، زیب منزل، 1-4-304/9/3، صدیق نگر، مشیر آباد،

"اردو دنیا" کا تازہ شمارہ بابت فروری 2010 باصرہ نواز ہوا، شکریہ۔ اس بار زبان، ادب اور تعلیم کے باب کے سبھی مضامین اچھے ہیں۔ ماہر جمالیات شکیل الرحمٰن نے اپنے مضمون و سعادت حسن منٹو کے افسانوں میں ٹوبہ ٹیک سنگھ کے پاگل بشن سنگھ، سرحد کی فہمیدہ اور ہتک میں سوگندھی کے المیہ کرداروں میں جمالیات کا جائزہ لیا ہے۔ اردو شعروادب میں موصوف جمالیات کے تعلق سے اپنی گراں قدر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ سکندر احمد نے وہابی تحریک کے توسط سے اردو زبان و ادب کے ارتقا پر اچھی روشنی ڈالی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہابی تحریک سے چند مسلمان اتفاق نہیں کرتے۔ علامہ اقبال کی نظم "بزمِ انجم" کا جائزہ بھی خوب ہے۔ محمد شجاعت علی راشد نے برصغیر ہندوپاک میں آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد اردو کے مسائل کا جائزہ لیتے ہوئے اس کے رسم الخط کے استحکام اور عہد حاضر میں لفظیات کی درستگی پر زور دیا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ اردو زبان کی بقا اس کے اپنے بنیادی رسم الخط پر ہی منحصر ہے۔ دوسرے لفظیات کے تعلق سے مجھے یہ کہتے ہوئے بڑا افسوس ہوتا ہے کہ طلبہ تو طلبہ اردو کے پروفیسرز بھی تلفظ کی بے شمار غلطیاں کرتے ہیں۔

"کلاسیکی ادب" کے تحت ابن نشاط کو پھولبن کا اقتباس داستانوں کا خوب لطف دے گیا اور شاہ نجم الدین مبارک آبرو کی غزلیں بھی خوب ہیں۔ ہماری مطبوعات کی سبھی تحریرات قابلِ ستائش ہیں۔ لیکن مضمون 1857 اور ہندی ادب" میں پی۔سی۔ گپتا نے 1857 کی جنگِ آزادی کو ہر جگہ غدر لکھا ہے۔ اس انقلاب اور جنگ کو انگریز غدر کا نام دیتے تھے۔ اردو دنیا کی ترتیب و تزئین کو ماہ بہ ماہ خوب سے خوب تر بنانے پر آپ اور اردو دنیا کے مدیر اعزازی

کو دل کی گہرائیوں سے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

■ **محمد جہانگیر ملک، انسان کالج ٹھکشا نگر، کشن گنج، بہار-855107**

آپ حضرات لائق صد احترام ہیں جو اردو کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔ بالخصوص آپ کے بارے میں تو یہ کہہ سکتا ہوں کہ اردو دنیا اور NCPUL آپ کی کمی کو پُر نہ کرسکا۔ لوگ تو آئے مگر کام کا جو تقاضا ہے اس پر شاید کوئی کھرا نہ اتر سکا، بالآخر آپ کو پھر لانا پڑا۔

ہماری ریاست بہار میں بھی اردو پر کام تو ہو رہا ہے مگر اس رفتار سے نہیں جتنا کہ کام کا تقاضا ہے۔ حالانکہ بہار میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے۔ راقم بھی آپ حضرات کی مہم میں شامل ہونا چاہتا ہے۔ اس سلسلے میں میں نے ریاضی طریقے سے ''بذریعہ ہندی اردو سیکھیں'' ایک نیا طریقۂ تحریر ایجاد کیا ہے جو روایتی طریقے سے ہٹ کر ہے۔ شاید اس کا عنوان سہل ریاضی طریقے سے ''بذریعہ ہندی ہندوستانی سیکھیں'' ہوتا تو زیادہ بہتر ہوتا اس لیے کہ اردو داں بننے کے لیے مشق اور مطالعہ ضروری ہے۔ کیونکہ اردو میں عربی، فارسی اور دیگر زبانوں کے بہت سے مشکل الفاظ ایسے ہیں جو صرف مطالعے سے ہی سمجھ میں آئیں گے۔ اس کے علاوہ لسانیاتی الجھنیں بھی ہیں جو ہمارے اور دیگر زبانوں کے ماہر لسانیات سلجھانے میں لگے ہوئے ہیں۔ ہوسکتا ہے از خود کتابچہ کی مدد سے لکھنے میں کچھ تشنگی باقی رہ جائے۔ اس کے کچھ نکات (Tips) ہیں جس کو بتا دینے پر مسئلہ حل ہوجائے گا۔ اس موضوع پر میری باقاعدہ ایک سوچ ہے اور لائحہ عمل بھی۔ چاہتا ہوں کہ ماسٹر ٹرینرز کا ایک گروپ تیار کردیں جو اردو اکادمیاں اور دوسری تنظیموں کے تعاون سے زمینی سطح پر کام کرے۔

■ **عبدالمجید، اڈیٹر اظہار حقیقت، 209، متصل آئی.ٹی.آئی.، اپوزٹ ریلوے کراسنگ، نیا گاؤں، جھانسی (یو.پی.-3)**

جھانسی میں فروغ اردو، تعلیمی بیداری اور سماجی اصلاح کے فروغ پر ایک روزہ کانفرنس کو ہم نے مزید عنوانات کا اضافہ کرکے اسے دو روزہ کردیا ہے آپ سے گزارش ہے خواہ ایک ہی اجلاس میں شرکت فرمائیں تشریف آوری کی درخواست ہے۔ یہ پروگرام بڑے پیمانے پر آپ کی توجہ اور کونسل کے مالی تعاون سے ممکن ہوسکا جس کے لیے ہم آپ کے شکر گزار ہیں۔ جبکہ دو روزہ ہونے سے اخراجات بہت بڑھ گئے ہیں۔ لیکن کونسل کے تعاون سے بڑی مدد ملی ہے۔

اس سے پہلے ہم ضلع جھانسی کی حد تک چار کانفرنسیں کرچکے ہیں جس کے اچھے نتائج برآمد ہوئے ہیں۔

ہم امید کرتے ہیں کہ آئندہ بھی آپ کی خصوصی توجہ اور کونسل کا تعاون ہمیں حاصل رہے گا۔ اس طرح کے اجتماعی پروگراموں کی ہمارے بندیلکھنڈ علاقے میں سخت ضرورت ہے جو سال دو سال میں وقفے وقفے سے ہوتے رہنا چاہیے۔

■ **ڈاکٹر نفیس احمد رضوی، ناصر لائبریری کوچۂ اردو، ابو بازار، گورکھپور-01**

اردو زبان نے ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کو نہ صرف سنوارا بلکہ ''انقلاب زندہ باد'' کے دو الفاظ کے نعرے سے ملک کی جنگ آزادی میں ایسی روح پھونکی کہ آخر کار ملک آزاد ہوگیا۔ اسی طور پر حب الوطنی کے نغمے'' سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا'' سے پورے ملک میں اس کی عظمت پیدا کردی۔ یقیناً اردو کے بہی خواہ ملک کے صحیح معنوں میں وطن پرست ہیں اور اردو کے مخالف ملک کے کبھی بھی محافظ نہیں ہوسکتے ہیں۔ آزادی سے قبل پورے ملک میں کثرت سے اردو زبان لکھنے، پڑھنے اور بولنے کا رواج عام تھا۔ ملک کو آزاد کرانے میں دو لفظ'' انقلاب زندہ باد'' نے کلیدی رول ادا کیا ہے۔ جس سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں۔ اردو مخالف آج تک اس کا بدل تیار نہیں کرسکے۔ بلکہ آج بھی اردو مخالفین اپنی کسی تحریک کو کامیاب بنانے میں انھیں دو الفاظ کا استعمال کرتے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد، سرسید احمد خاں، مولانا حسرت موہانی، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی کے علاوہ بڑی تعداد میں مسلم رہنما و قائدین و اہل قلم حضرات نے مختلف رسائل و اخبارات اور مضامین اردو زبان میں شائع کراکر اہل وطن کی ملک کی جنگ آزادی میں رہنمائی کی۔ ملک آزاد ہونے کے بعد ایک دستور بنا کہ باشندگان ہند اردو کے آئینی حقوق کو جانیں اور اپنے فرائض سمجھیں دوسروں کی شکوہ شکایت نہ کرکے فرض کی ادائیگی کے لیے عملی قدم اٹھائیں۔ دراصل نہ اردو ہم سے چھینی جارہی ہے اور نہ یہ ہم سے دور ہوتی جارہی ہے۔ بلکہ المیہ یہ ہے کہ اردو کے حامی دوم بھرنے والے خود ہی اسے چھوڑتے جارہے ہیں اور اس سے دوری بنائے ہوئے ہیں۔

■ **محمد عرفان، محلہ میمست، ہاؤس نمبر-11، جون پور-222001**

اردو دنیا دسمبر 09 کا شمارہ بھی اپنی دیرینہ روایت کے مطابق اپنے دامن میں علمی، تحقیقی اور سائنسی معلومات سمیٹے ہوئے ہے۔ اس شمارے میں محترمہ نشاط فاطمہ کا ایک مختصر مقالہ ترقی پسند شاعر وامق جون پوری پر'' ذکرِ بتاں اور فکر جہاں کا شاعر وامق جون پوری'' شائع ہوا ہے۔ مقالے میں چونکہ کئی مقامات پر مقالہ نگار سے چوک ہوئی ہے اور حوالے اور مصرعے نامکمل درج ہوئے ہیں۔ اس لیے اختصار کے ساتھ چند معروضات قارئین کی خدمت میں پیش کی جاتی ہیں۔ وامق پر پہلی باضابطہ کتاب جوان کی حیات میں شائع ہوئی'' وامق جون پوری شخص اور شاعر 1991'' ہے جس کے مصنف ایس.ایم.عباس جون پوری ہیں۔

اس کے علاوہ وقتاً فوقتاً وامق پر ملک کے مقبول جرائد میں ممتاز اہل قلم کی تخلیقات بھی شائع ہوتی رہی ہیں اور کئی رسائل و جرائد نے وامق پر خصوصی گوشے بھی نکالے۔ ہندی ادیبوں اور شاعروں نے بھی وامق پر کام کیا جن میں

واحق شناس اجے کمار جون پوری نے تو واحق اور ان کی تخلیقات کو اپنی زندگی کا مقصد ہی بنالیا۔

واحق کی مشہور نظم ''پنجاب'' ہے جس کے کئی مصرعے بھی لفظی ترمیم کا شکار ہوگئے ہیں اور مکمل مصرعے بھی مربوط نہیں ہیں۔

یہاں میرا مقصد نشاط فاطمہ کی حوصلہ شکنی نہیں ہے بلکہ اشارہ ہے ان کے لیے اور نئے قلم کاروں کے لیے کہ اپنے مقالے اور تحقیقی مضامین کو پوری دلجمعی سے نظر ثانی کے بعد شائع کرنے کے لیے رسائل و جرائد کو ارسال کریں۔

■ **شمیم احمد صدیقی، سی-2، نسیم منزل، سیتاپور روڈ، لکھنؤ-226020**

کونسل میں آپ کی دوبارہ آمد پر تمام محبانِ اردو کو جو آپ کی سرپرستی میں کی گئی فروغ اردو کی کاوشوں کو دیکھ چکے ہیں بے حد مسرت ہوئی ہے اور جس کا اظہار ''اردو دنیا'' کے ہر شمارے میں شائع '' آپ کی بات'' سے ہوتا رہا ہے۔ فی الوقت خاکسار دو تجاویز پیش کررہا ہے۔ امید ہے کہ آپ کو پسند آئیں گی۔

(1) کسی زمانے میں بچوں کے کئی اچھے ماہنامے شائع ہوتے تھے جو نئی نسل میں فروغ اردو کا مؤثر ذریعہ تھے۔ اگر کونسل بھی اردو اکادمی دہلی کی طرح کم قیمت پر کوئی ماہنامہ شائع کرائے تو اس کی ضرور پذیرائی ہوگی اور دور رس نتائج نکلیں گے۔

(2) ملک کی آزادی کے بعد کئی دہائی تک پوسٹ آفس میں اردو داں عملہ دستیاب تھا اس لیے اردو میں پتہ لکھے ہوئے خطوط کی ترسیل میں کوئی دشواری نہ ہوتی تھی۔ اب صورت حال یہ ہے کہ کونسل کو بھی مجبوراً اپنے خطوط پر انگریزی میں پتہ تحریر کرنا پڑتا ہے۔ لہٰذا پوسٹ آفس کے عملے کو اردو داں بنانے کے لیے ایک ایسا جزوقتی چھ ماہی کورس شروع کیا جائے جس میں شام کو ایک گھنٹہ تعلیم دی جائے اور پڑھنے والوں کو کچھ رقم بطور وظیفہ بھی دی جائے۔ شہروں اور بڑے قصبات میں کونسل کے اسٹڈی سینٹر اور کمپیوٹر سینٹر اس کورس کو چلانے کے لیے استعمال ہوسکتے ہیں۔

■ **عارف حسن وسطوی، نیوز پروڈیوسر، ایچ وائی ٹی وی، حیدرآباد**

فروری کا شمارہ کچھ تاخیر سے ملا اور میں شاید کچھ زیادہ ہی تاخیر سے اپنی بات کہنے بیٹھا ہوں۔ معذرت چاہتا ہوں۔ یہ شمارہ بھی پچھلے شماروں کی طرح خوب ہے۔ تمام مشمولات عمدہ ہیں۔ شکیل الرحمن کی تحریر'' اردو فکشن میں ٹریجڈی کا جمال: سعادت حسن منٹو کے حوالے سے'' ایک الگ طرح کا لطف دیتی ہے۔'' وہابی تحریک اور اردو'' سکندر احمد کا ایک جامع مضمون ہے۔ سلیمان اطہر جاوید اور محمد شجاعت علی ارشد کی تحریریں قاری کو اپنی جانب کھینچتی ہیں۔ آفاق عالم صدیقی نے زبان و ادب کے تدریسی مسائل سے اچھی گفتگو کی ہے۔ ماحولیات پر شائع تینوں مضامین وقت کے مطابق ہماری توجہ کے طالب ہیں۔

تمنا مظفر پوری کی تجویز آپ کی توجہ کی طالب ہے جس میں انھوں نے اردو دنیا کے شمارے میں بچوں کے لیے ایک گوشہ مختص کرنے کی بات کہی ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ خاطر خواہ اس پر توجہ دی جائے گی۔

■ **مجاہد فراز، C-6/107، اسالت پورہ، مرادآباد-244001**

'' اردو دنیا'' شمارہ-2 فروری 2010 زیر مطالعہ ہے۔ آپ کی محنت رنگ لارہی ہے۔ یہ اپنی طرز کا منفرد جریدہ ہے۔ اردو تعلیم کے مسائل، اردو خبرنامہ کے تحت اردو دنیا کی خبریں اور تمام مضامین، اپنی اپنی جگہ اہم ہیں۔ البتہ شاعری کے گوشے میں اضافے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ رسالے میں شامل قارئین کے خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی مقبولیت میں بدستور اضافہ ہورہا ہے اور قارئین کا حلقہ بڑھتا جارہا ہے۔

■ **ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی، پرنسپل گورنمنٹ سینئر سیکنڈری اسکول پہلو، ٹونک**

'' اردو دنیا'' فروری 2010 موصول ہوا۔ آپ نے'' آپ کی بات'' قارئین کے خطوط میں خاکسار کا خط سرفہرست شامل فرمایا۔ اس کے لیے بہت بہت شکریہ۔'' اردو دنیا'' کو میں ایک مشن، تحریک اور عزم کا درجہ دیتا ہوں۔ زبان و ادب اور تعلیم کے فروغ کے لیے آپ ہر شمارے میں فکرانگیز مضامین شائع فرماتے ہیں یہ ایک خوش آئند عمل ہے اس شمارے میں بالترتیب'' اردو اکیسویں صدی میں''،'' اردو زبان نئے افق'' اور'' زبان و ادب کی تدریس کے مسائل'' شائع ہوئے ہیں۔ یہ تینوں مضامین اردو زبان کی فکر جستجو اور عالمی سطح پر اردو کے لسانی فروغ کا احاطہ کرتے ہیں اور اسے آفاقی درجہ دلاتے ہیں۔

'' اردو اکیسویں صدی میں''، محمد شجاعت علی راشد نے اظہار اثر کے حوالے سے بڑی اہم ضرورت کی طرف اشارہ کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ'' عوام میں خواندگی کا اوسط بھی کئی گنا بڑھ گیا ہے۔ لیکن اردو کے قارئین ناپید ہوتے جارہے ہیں۔'' دہلی کے حوالے سے یہ بات کی گئی ہے لیکن ملکی سطح پر دیکھیں تو خواندگی کا اوسط بھی کم ہے اور قارئین کی کمی بھی ہے۔ جب تک ملک میں اردو زبان کی خواندگی کی شرح صد فی صد نہیں ہوگی اس وقت تک اردو کے قارئین میں اضافہ ہونا ناممکن ہے۔ اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ اردو زبان بھی مذاہب اور طبقوں کی زبان ہے لیکن بالخصوص ان میں مسلمان بھی شامل ہیں۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ مسلمانوں کی خواندگی کی شرح اس ملک میں دوسرے مذاہب کے لوگوں سے کم ہے۔ 2001 کی مردم شماری کے مطابق مسلمانوں کی خواندگی شرح 59-1 فیصد ہے۔ اس لحاظ سے ایک بڑی اقلیت تعلیم کی روشنی سے محروم ہے۔ اسی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے نیشنل لٹریسی مشن اور وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند نے مسلم اقلیت خصوصاً عورتوں کی تعلیم کے لیے ایک ٹاسک فورس بنائی جس میں ہندوستان کے ماہرین تعلیم بالغان کو شامل کیا گیا۔ (خاکسار کو بھی

راجستھان سے اس ٹاسک فورس کی نمائندگی حاصل ہوئی) اور جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے اسٹیٹ ریسورس سینٹر کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شعیب عبداللہ کو اس کا کنوینر بنایا گیا۔ اس ٹاسک فورس نے ستمبر 2009 کو پروجیکٹ کی ڈرافٹ رپورٹ پیش کردی ہے۔ امید ہے کہ عنقریب یہ پروجیکٹ شروع ہوجائے گا۔

اردو کے حوالے سے اس پروجیکٹ کی یہ اہمیت ہے کہ اقلیتی طبقوں کو ان کی مادری زبان اردو میں بھی خواندہ کیا جائے گا۔ اردو کے تعلیمی سینٹر کھولے جائیں گے۔ پنچایت سطح تک تعلیم کا نظام رہے گا۔ انھیں تعلیم کے ساتھ ہنر کی تربیت سے بھی جوڑا جائے گا۔ اردو کی سرکاری اور غیر سرکاری تنظیموں خصوصاً اردو اکادمی، مدرسہ بورڈ، وقف بورڈ، اقلیتی بورڈ وغیرہ کو بھی اس مشن سے جوڑا جائے گا۔ ہندوستان میں چل رہے ترقیاتی منصوبوں مثلاً SSA, NAREGA, ICDS, JNN URM, IAY سے بھی استفادہ کیا جائے گا۔

اس پروجیکٹ میں خصوصاً پی ایم کے پندرہ نکاتی پروگرام، تعلیمی جماعت، تعلیمی ادارے، تعلیم بالغان کے ادارے کے علاوہ علما، امام، مولوی، استانی، وعظ، جمعہ کا خطبہ، مدرسہ، مسجد، وقف کو بھی جوڑا جائے گا۔ اس کے خاطر خواہ نتائج آئیں گے۔ ملک اور بیرون ملک اردو زبان عوام سے جڑ جائے گی۔ اس کے بعد ہی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اردو زبان اپنے نئے افق تک رسائی کرچکی ہے۔ اردو کے نئے افق کی نشاندہی سید اطہر جاوید نے اپنے مضمون ''اردو زبان نئے افق'' میں کی ہے۔ دراصل یہ عالمی کانفرنس کی روداد ہے جو بہت اختصار اور جامعیت سے پیش کی گئی ہے۔ اس میں پڑھے گئے مقالات اردو زبان کی اہمیت و افادیت اور اس کے فروغ و توسیع کو منظر عام پر لاتے ہیں۔ اردو کی آفاقیت مسلّم ہے لیکن اردو جہاں پیدا ہوئی اس ملک میں اسے پُر وقار طریقے سے پڑھنے اور بڑھنے کے مواقع اب بھی درکار ہیں۔ اردو کی خواندگی مہم سے لے کر ابتدائی، ثانوی، اعلیٰ ثانوی اور اعلیٰ تعلیم تک تدریس کے مسائل اور ان کے حل تلاش کرنے اور ان پر عمل کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ یکساں نصاب، یکساں تدریسی تربیت، یکساں تعلیمی نظام کے لیے قومی سطح پر غور و فکر کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے SIERT, NCERT ڈائٹ، M.S.A. SSA اردو اکادمی، مدرسہ بورڈ، ڈائرکٹریٹ ایجوکیشن، صوبائی حکومتوں کے SRC کتابوں کی اشاعت کے ادارے، تعلیمی تربیتی ادارے، مدرسے مکتب اسکول اور رضاکار تنظیمیں اہم رول ادا کرسکتی ہیں۔ عام طور پر اردو تدریس کے مسائل پر خوب لکھا جاچکا ہے۔ مثلاً اردو اساتذہ کے تقرر کا مسئلہ، اردو اساتذہ کے ریفریشر کورس، تدریسی نصاب، ذریعۂ تعلیم اردو اساتذہ کی تربیت اور تربیتی ادارے وغیرہ ایسے مسائل ہیں جن پر خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے ''زبان وادب کی تدریسی کے مسائل'' بھی ایک اہم اور بنیادی مسئلہ ہے۔ اس مسئلے پر آفاق عالم صدیقی نے اہم مسائل کی طرف اشارے دیے ہیں۔ انھوں نے اپنے مضمون میں ماہر تعلیم پروفیسر محمد حسن کے علاوہ اردو تدریس سے تعلق رکھنے والے سلیم فارانی کی کتابوں کے حوالے سے اپنی بات کہی ہے۔ آفاق عالم نے اردو کے ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ ثانوی اور اعلیٰ نصاب کے تحت زبان کی درس و تدریس کا عمل اور زبان کی تدریسی مسائل کی نشاندہی کی ہے لیکن اردو تدریس کے نکات اور اسلوب کی طرف بھی دھیان دینے کی ضرورت ہے۔ زبان کی تدریس میں کلاس روم میں طلبہ اور مدرسین کے درمیان خوشگوار ماحول پیدا کرنے کے لیے تکنیکی تدریسی نکات کا لحاظ بھی نہایت ضروری ہے۔

اردو تدریس کے مسائل میں ایک اہم مسئلہ کتب اور کنجیوں، پاس بکوں، ون ویک سیریز کا ہے۔ زیادہ تر طلبہ نصابی کتب سے زیادہ ان کنجیوں اور پاس بکوں کا سہارا لے کر محض پاس ہونے تک اپنا مدعا سمجھتے ہیں۔ اردو اساتذہ کو چاہیے کہ وہ اپنے تدریسی تجربات کا استعمال کرتے ہوئے طلبہ میں ذاتی صلاحیت اور اعتماد پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ دوسرے ان پاس بکوں کے پبلشرس کو ہدایت دیں کہ وہ اردو کی بنیادی اور مستند کتابوں سے نقل کرکے خود مصنف بن کر طلبہ کو گمراہ کر رہے ہیں۔ یہ کنجیاں اغلاط کا پلندہ ہیں ان سے طلبہ کے سیکھنے کے معیار پر برا اثر پڑ رہا ہے۔ ان کے سوچنے اور سمجھنے کی قوت ختم ہوکر رٹنے رٹانے کی طرف رجوع ہورہی ہے۔ اس مسئلہ پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کا واحد حل یہ ہے کہ نصابی کتابوں میں ایسا مواد دیا جائے جو طلبہ کی ضرورتوں اور ان کی تشنگی کو پورا کردے۔ اس سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ مہنگی کنجیوں کو خریدنے کے بجائے طلبہ کم قیمت میں معیاری کتابیں حاصل کرسکیں گے۔ NCPUL نے اس میں پہل کی ہے۔ طلبہ کے لیے کتابیں سستی قیمت میں شائع کی ہیں۔ ان میں تربیتِ اساتذہ کے لیے کتابیں منظر عام پر آئی ہیں اور امید ہے کہ آئندہ بھی NCPUL اس طرف خصوصی توجہ دے گی۔ اردو اساتذہ سے بھی یہ امید کی جاتی ہے کہ وہ زبان کی تدریس کے مقاصد کو صد فی صد پورا کریں گے۔ اس کے لیے زبان کی تدریس کس نوعیت کی ہوگی! کیا کیا عوامل درکار ہوں گے، مؤثر تدریس کی کیا کیا شکلیں ہوں گی؟ تدریس کس قسم کی ہوگی اور کس طرح دی جائے گی؟ زبان میں کون کون سی اصناف کی تدریسیں ہوں گی؟ قواعد کس طرح پڑھائی جائے گی؟ ان تمام باتوں کا لحاظ رکھتے ہوئے زبان کی تدریس ہونا چاہیے۔ درسی مشاغل کے علاوہ طلبہ کی ذہنی اور جسمانی نشوونما کے لیے غیر درسی مشاغل بھی بہت ضروری ہیں۔ مثلاً کھیل کود، پی۔ٹی۔ باغبانی، سیر و تفریح، تقریر، مباحثہ، ڈراما، جھلکی وغیرہ۔

''اردو کسی ایک طبقے یا مذہب کی نہیں ہے'' یہ مقولہ صد فی صد صحیح ہے۔ اردو زبان سب کی زبان ہے۔ اس میں گیتا اور قرآن بھی۔ انجیل بھی اور

مہابھارت بھی، توریت و زبور بھی۔ خوشی ہے کہ فروری 2010 کے ''اردو دنیا'' کے شمارہ میں ''دل کی گیتا'' یعنی شریمد بھگوت گیتا کا ترجمہ اردو نظم میں مترجم خواجہ دل محمد پر تبصرہ شائع ہوا ہے۔ قابلِ مبارکباد ہیں آپ، کہ آپ نے NCPUL کی جانب سے اسے شائع فرمایا ہے۔ بہت عمدہ اور دلنشین ترجمہ ہے۔ گیتا کے یوں تو بے شمار تراجم نثر و نظم میں شائع ہوئے ہیں۔ لیکن میں یہاں آپ کی توجہ راجستھان کے اس منظوم ترجمے کی طرف دلانا چاہتا ہوں جسے منشی پنالال بھارگو نے 1917 میں کیا تھا اور وہ ترجمہ شائع بھی ہوا اس کی ایک جلد میرے پاس محفوظ ہے۔ یہ ترجمہ بھی معیاری ہے۔ اس کے معیار کو دیکھتے ہوئے میں نے ''راجستھان میں سنسکرت تصانیف (خصوصاً گیتا کے تراجم) پر ایک مختصر مضمون قلمبند کیا ہے۔ جو ابھی غیر مطبوعہ ہے۔ میری خواہش ہے کہ ''اردو دنیا'' کے قارئین تک یہ مضمون پہنچے لہٰذا ٹائپ کروا کر ایک کاپی آپ کو ارسال کر رہا ہوں۔ امید کہ شرف قبولیت بخشیں گے۔

■ **رئیس الدین رئیس، 1725/10، دہلی گیٹ، علی گڑھ-01**

کل رات ای ٹی وی اردو پر جانکاہ خبر کہ مخمور سعیدی صاحب اس دنیا میں نہیں رہے پڑھ کر غریقِ غم ہو کر رہ گیا یقین آنے میں بھی دیر لگی میرے ان سے دیرینہ مراسم تھے اللہ ان کو غریقِ رحمت کرے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے اب اظہار افسوس، تلقین صبر اور دعائے مغفرت کے سوا چارہ بھی کیا ہے

سبھی اپنے بچھڑتے جا رہے ہیں
یہ دنیا خالی ہوتی جا رہی ہے

اردو ادب کے لیے یہ ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ وہ ایک عظیم شاعر، ادیب، صحافی ہی نہیں تھے انتہائی خلیق انسان تھے۔

■ **ڈاکٹر حسن رضا، مظفر پور**

سلام مسنون، ''اردو دنیا'' کے گذشتہ تین شماروں میں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ لسانی و تعلیمی مضامین اور رپورتاژ کے علاوہ ادبی مضامین بھی ''اردو دنیا'' کی تدوین و آرائش میں چار چاند لگا رہے ہیں۔ ایسے مضامین کی تدوین سے رسالہ زبان اور ادب نیز نفسیاتی و تعلیمی مضامین سے رغبت رکھنے والوں کے لیے جاذبِ نظر بنا رہے گا اور اس کی رسائی کا دائرہ مسلسل بڑھتا جائے گا۔

■ **جلیل عشرت، آر. بی. منزل، جہانگیری محلہ، آسنسول-713302**

''اردو دنیا'' پابندی سے پڑھ رہا ہوں۔ طبیعت سیر ہو جاتی ہے۔ واقعی نئی نسل کی ذہنی تربیت کا یہ آئینہ کار بتدریج اپنی شناخت کی طرف رواں دواں ہے آپ کی زبردست محنت نے بساطِ ادب میں قوس وقزح کا جو رنگ بھر دیا ہے وہ قابلِ دید ہے۔ میری دعا ہے کہ یہ حسین و جمیل رسالہ سدا نکلتا رہے۔

■ **شکیل شاغل، حاجی مارکیٹ، باڑہ چاکیہ، ایسٹ چمپارن-845412**

نہایت ہی خوبصورت اور دلکش سرورق سے آراستہ ''اردو دنیا'' بابت ماہ فروری موصول ہوا۔ ماہنامے کو دیدہ زیب اور دلکش بنانے کے لیے مبارک باد قبول فرمائیں۔ قومی اردو کونسل کے عہدیداران، اراکین، قارئین اور اردو دوستوں کو کونسل کی نہایت ہی خوبصورت عمارت ''اردو بھون'' مبارک ہو۔

''ہماری بات'' کے تحت آپ نے کہا ہے کہ ''سائنس اور ٹیکنالوجی کے شعبوں میں ہونے والی ترقیات اور عصری تناظر سے ہم آہنگ علوم کا رشتہ اردو سے قائم کرنے کے لیے کونسل نے ملک گیر سطح پر ڈی.ٹی.پی. کے مراکز قائم کیے ہیں اور 73785 طلبہ بشمول 25424 طالبات کو ڈپلوما سرٹیفکیٹ دیا جا چکا ہے اور ان میں سے بیشتر طلبہ و طالبات روزگار سے منسلک ہو گئے ہیں۔'' کونسل کے ذریعے قائم کردہ ڈی.ٹی.پی. کورس کی اپنی ایک خاص اہمیت ہے اور اس میں طلبہ و طالبات خصوصی دلچسپی رکھتے ہیں کیونکہ انھیں جعلی اور فریب کا خطرہ نہیں ہوتا اور نوکریاں حاصل کرنے میں آسانیاں ہوتی ہیں۔ بلاشبہ یہ کونسل کی ایک عظیم الشان کامیابی ہے اور اس کا سہرا آپ کے سر بندھتا ہے۔

آل انڈیا سول سروسیز اور اسٹیٹ پبلک سروس کمیشن کے امتحانوں میں شرکت کرنے والوں کے لیے کونسل اپنے مصارف پر مراکز قائم کرے گی اور مواد فراہم کرے گی۔ یہ ایک انقلابی قدم ہے جس کا میں پُرجوش خیر مقدم کرتا ہوں۔

□□□

اردو زبان کی تدریس

مصنف: معین الدین

اردو کیسے پڑھی اور پڑھائی جائے درس و تدریس کے جدید سائنٹفک اصولوں کی روشنی میں تدریسی طریقۂ کار کا تعین طلبہ اور اساتذہ دونوں کے لیے یکساں مفید ہے۔ یہ کتاب طلبہ و اساتذہ کی انھی ضرورتوں کو پورا کرتی ہے۔

پانچواں ایڈیشن، صفحات: 148، قیمت-/29 روپے

ہماری بات

گذشتہ 2 مارچ 2010 کو عہد ساز نقاد اور اردو دنیا کے اعزازی مدیر اور فکر و تحقیق کے ادارتی مشیر مخمور سعیدی کی مختصر علالت کے بعد وفات ہوگئی۔ ان کی موت سے اردو زبان و ادب کا نقصان تو ہوا ہی ہے، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے لیے بھی یہ ایک بڑا سانحہ ہے۔ وہ سال 2000 سے قومی اردو کونسل سے وابستہ تھے اور ''اردو دنیا''، ''فکر و تحقیق'' کی ادارتی ذمے داریوں کے ساتھ ساتھ ادارے کی تمام علمی و ادبی سرگرمیوں میں پیش پیش رہے۔ شعر و ادب پر گہری نظر اور ادبی صحافت کے طویل تجربے کے پیش نظر کونسل کی جانب سے انھیں ادبی مشیر مقرر کیا گیا تھا۔ انھوں نے نہایت محبت اور بڑی لگن کے ساتھ اپنے فرائض منصبی انجام دیے۔ سہ ماہی ''فکر و تحقیق'' آج علمی دنیا میں اپنے تحقیقی اور بے لاگ مضامین کی وجہ سے اپنی منفرد شناخت رکھتا ہے۔ اس کے قلم کاروں میں ہر مکتبۂ فکر اور ہر عمر کے لوگ شامل ہیں۔ کسی بھی قسم کی عصبیت یا ذہنی تحفظ سے رسالے کو پاک رکھنے میں انھوں نے کامیابی حاصل کی اور فکر و تحقیق کو ایک رجحان ساز رسالہ بنایا، اردو دنیا آج ہندوستان کے اردو رسائل میں اپنی تعداد اشاعت کے اعتبار سے سرفہرست ہے۔

آج جب مخمور سعیدی ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں تو کتنی ہی باتیں ذہن میں آرہی ہیں۔ دس سال پہلے ایک نرم آواز سنی تھی، ''حضور اگر اجازت ہو تو عرض کروں۔'' یہ آواز تھی مخمور سعیدی کی، میں کل ہند ریاستی اردو اکادمیوں کی کانفرنس میں قومی اردو کونسل اور اکادمیوں کے باہمی تال میل پر ایک ایکشن پلان کی بات کر رہا تھا اور مخمور صاحب ان دنوں دہلی اردو اکادمی کے سکریٹری تھے۔ دس سال بعد 28 فروری 2010 کو یہی آواز ''حضور اگر اجازت ہو تو میں جے پور چلا جاؤں وہاں ایک ڈاکٹر ہے جس کو میں جانتا ہوں وہیں علاج بھی ہوگا۔'' میں نے کہا ''مخمور صاحب دہلی میں تو علاج بہتر ہوگا، اچھے ہاسپٹل ہیں اور اگر کسی مدد کی ضرورت ہو تو وہ بھی مہیا ہے۔'' ''نہیں حضور مجھے جانے کی اجازت دیجیے۔'' اور وہ چلے گئے..... شرافت، نفاست اور وضع داری کا ایسا پیکر میں نے اردو دنیا میں نہیں دیکھا ہے۔

وہ گذشتہ 60 برسوں کے شعری و ادبی منظرنامے کے عینی شاہد ہی نہیں اس میں شریک بھی تھے۔ 31 دسمبر 1934 کو ٹونک، راجستھان میں ان کی پیدائش ہوئی تھی۔ سترہ، اٹھارہ سال کی عمر میں دہلی آئے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ دہلی میں انھوں نے مختلف سرد و گرم حالات کا مقابلہ کیا۔ فروری 1953 میں گوپال متل نے اپنے رسالے ''تحریک'' میں انھیں معاون مدیر مقرر کیا جس سے وہ دسمبر 1977 میں اس وقت تک وابستہ رہے جب تک کہ یہ رسالہ بند نہ ہوگیا۔ کچھ برس بعد دہلی اردو اکادمی میں انھیں ملازمت ملی جہاں سے انھوں نے ماہ نامہ ''ایوان اردو'' اور بچوں کا رسالہ ''امنگ'' جاری کیا۔ وہ اردو اکادمی دہلی کے سکریٹری کے عہدے سے 1998 میں سبک دوش ہوئے۔

مخمور سعیدی کی علمی و ادبی فتوحات کی فہرست طویل ہے۔ ان کے دس شعری مجموعے، تین ادبی مضامین کے مجموعے، انگریزی، فارسی اور ہندی کی 15 کتابوں کے اردو میں تراجم اور دس مرتبہ کتابیں ہیں۔ ''راستا اور میں'' ان کا آخری شعری مجموعہ ہے جس پر ساہتیہ اکادمی انعام دیا گیا۔ غزل اور نظم دونوں اصناف میں انھوں نے وقیع اثاثہ چھوڑا ہے۔ ان کی غزلوں اور نظموں میں فنی اور فکری سطح پر اعتدال و توازن ملتا ہے۔ انھوں نے جدید لب و لہجے کے ساتھ ساتھ صالح ترقی پسند اقدار کی عکاسی پر زور دیا۔ انھوں نے کسی مخصوص نظریے کی پابندی نہیں کی بلکہ جو کچھ محسوس کیا، اسے پورے خلوص کے ساتھ کسی ذہنی یا فکری تحفظ کے بغیر شاعری کی صورت میں ڈھال دیا۔ وہ فارمولا بند شاعری کے قائل نہیں تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے موضوعاتی ترقی پسند شاعری کی مخالفت کی مگر ترقی پسند شاعری کے تمام موضوعات مثلاً ظلم و استحصال، تعصب و تنگ نظری، غربت و افلاس اور ریاست کے جبر پر انھوں نے بے حد مؤثر نظمیں لکھیں۔ موضوعات کے انتخاب، لفظوں کے استعمال اور فنکارانہ اظہار پر قدرت کے سبب ان کی شاعری میں زبردست تاثر ملتا ہے۔ انھوں نے اپنی نظموں اور غزلوں میں کلاسیکی لب و لہجے میں جدید موضوعات و مسائل کی خوبصورت عکاسی کی ہے۔ تنہائی، بھیڑ میں کھو جانے کا احساس، شکستِ خواب، خود بیزاری، ماضی کی یاد، افسردگی، ٹوٹتے رشتے، گم ہوتی اقدار، حالات کا جبر، مقتدر طبقے کا ظلم و استحصال، ہجرت کا کرب، عام آدمی کے مسائل، فرقہ واریت وغیرہ مختلف موضوعات ہیں جن سے ان کی شاعری کا خمیر تیار ہوا۔ زبان اور محاورے پر عبور کے ساتھ ساتھ اردو کے مکمل شعری و ادبی سرمائے خصوصاً کلاسیکی ادب پر ان کی گہری نظر تھی، فارسی زبان و ادب سے بھی وہ بخوبی واقف تھے اور غالب کی کتاب ''دستنبو'' کا اردو میں ترجمہ بھی انھوں نے کیا تھا۔

شاعری کے علاوہ مخمور سعیدی نے نثر میں بھی اپنی صلاحیت کا جوہر دکھایا۔ ان کی تحریر حشو و زوائد سے پاک ہوتی تھی اور بغیر کسی پیچیدگی یا الجھاوے کے وہ دو ٹوک انداز میں اپنا مطمح نظر پیش کر دیتے تھے۔ ان کے مختلف تنقیدی مضامین اس بات کا ثبوت ہیں۔ دو تین برس پہلے ساہتیہ اکادمی کی جانب سے ان کی کتاب ''داغ دہلوی'' شائع ہوئی تھی۔ اس مونوگراف میں انھوں نے نہایت تحقیقی جستجو کے ساتھ داغ کے خاندانی پس منظر، ان کے سوانحی حالات اور ادبی خدمات پر روشنی ڈالی ہے۔

اپنے علمی و ادبی کارناموں کے علاوہ مخمور سعیدی شخصی سطح پر بھی ایک بہترین انسان تھے۔ ان کی شرافت، نیک نفسی، ضبط و توازن، خلوص و محبت کے معترف بھی ہیں۔ وہ ایک بے لوث، بے ریا اور قلندر صفت انسان تھے۔ خود تشہیریت اور تعصب و تکبر انھیں چھو تک نہیں گیا تھا۔ ان کا صرف قد ہی اونچا نہ تھا کردار و اعمال کے لحاظ سے بھی وہ ایک بلند پایہ شخص تھے۔ اس بلند پایہ شخص کا دنیا سے اٹھ جانا ایک بڑا سانحہ ہے اردو شعر و ادب کے لیے بھی، اردو کونسل کے لیے بھی اور مخمور صاحب کے لاتعداد چاہنے والوں کے لیے بھی۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

توقیر راہی

گوشۂ مخمور سعیدی

سوانحی خاکہ

نام: سلطان محمد خاں/**قلمی نام:** مخمور سعیدی

والد کا نام: جناب احمد خاں ناز‌ش

تاریخ پیدائش: 31/دسمبر 1934، ٹونک (راجستھان)

تعلیم:

- ادیب، ادیب ماہر، ادیب کامل (جامعہ اردو، علی گڑھ)
- منشی (عربی، فارسی بورڈ، الہٰ آباد)
- ایم۔اے۔ (آگرہ یونیورسٹی)

ملازمت:

- ماہنامہ تحریک دہلی، بحیثیت معاون مدیر (فروری 1953 تا دسمبر 1977)
- ماہ نامہ گل فشاں دہلی، بحیثیت مدیر (جنوری 1978 تا دسمبر 1978)
- ماہ نامہ نگار دہلی، بحیثیت مدیر (جنوری 1979 تا دسمبر 1979)
- ماہ نامہ ''ایوان اردو'' اور ''امنگ دہلی'' اردو اکادمی، حکومت دہلی، بحیثیت بانی۔مدیر (1981 تا 1999)
- اسسٹنٹ سکریٹری، دہلی اردو اکادمی، دہلی (1995 تا 1996)
- سکریٹری، دہلی اردو اکادمی، دہلی (1997 تا 1999)
- ماہ نامہ ''اردو دنیا'' اور سہ ماہی ''فکر و تحقیق'' بحیثیت اعزازی مدیر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، حکومت ہند (2000 تا 2010)

تخلیقات:

- شعری مجموعے— ''گفتنی''، ''سیاہ بر سفید''، ''آواز کا جسم''، ''سب رنگ''، ''واحد متکلم''، ''آتے جاتے لمحوں کی صدا''، ''بانس کے جنگلوں سے گزرتی ہوا''، ''دیوار و در کے درمیان''، ''عمر گزشتہ کا حساب'' (دو جلدوں میں)، ''راستہ اور میں''۔ ● پیڑ گرتا ہوا، گھر کہیں گم ہو گیا (ہندی رسم الخط میں)

نثری مضامین کے مجموعے:

● بازدید ● میرے عہد کی صدائیں ● وادیِ خیال ● دستنبو (غالب کی فارسی کتاب کا اردو ترجمہ)

دیگر کتب:

- دل کی گیتا— خواجہ دل محمد (ترتیب و تدوین)
- دس عصری ادبی اردو کتابوں کی تدوین:
- پندرہ کتابوں کا اردو ترجمہ (انگریزی، ہندی، فارسی سے)

ادبی خدمات اور کارناموں پر کتابیں، خصوصی گوشے اور ریسرچ:

- مخمور سعیدی—ایک مطالعہ، ڈاکٹر اطہر فاروقی ● بھیڑ میں اکیلا، شین کاف نظام
- گوشۂ مخمور (شعر و حکمت، حیدرآباد): مرتبین: پروفیسر شہریار، پروفیسر مغنی تبسم
- مخمور سعیدی اور ان کے کارنامے (مقالہ پی۔ایچ۔ڈی، محمود احمد ندیم، برکت اللہ یونیورسٹی، بھوپال)

انعامات و اعزازات:

- شاعری ایوارڈ (دہلی اردو اکادمی، دہلی)
- شاعری ایوارڈ (بہار اردو اکادمی، پٹنہ)
- شاعری ایوارڈ (اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ)
- نثری ایوارڈ (بنگال اردو اکادمی، کولکاتا)
- محمود شیرانی ایوارڈ (راجستھان اردو اکادمی، جے پور)
- فراق گورکھپوری ایوارڈ (فراق سمان سمیتی، گورکھپور)
- شاعری ایوارڈ (ساہتیہ اکادمی، دہلی)
- راجستھان گورو ایوارڈ (راجستھان استھاپنا دیوس سمیتی، جے پور)
- قاضی عبدالودود ایوارڈ، پٹنہ
- بیگم اختر غزل ایوارڈ
- انمول ایوارڈ (راجستھان کلا سنگم، کوٹہ)
- غالب ایوارڈ (ایوان غالب، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی)

سفر:

بیرون ممالک: امریکہ، انگلینڈ، ناروے، ڈنمارک، سعودی عرب، دبئی، ابو ظہبی، شارجہ، قطر، عمان، پاکستان وغیرہ

اندرون ملک: ہندوستان کے تقریباً ہر بڑے شہر میں مشاعرہ اور سیمینار میں شرکت۔

انتقال: 2/مارچ 2010— سہ پہر 3:00 بجے، ٹونک (راجستھان)

□□□

چندر بھان خیال

ایک نظم، مخمور سعیدی کے لیے

مخمور! میرے بھائی میں کیسے یقیں کروں
واماندگیِ روح کا احساس اور تم
پیشِ نگاہ آئینۂ یاس اور تم

ہوگا تمھیں بھی یاد کہ شوقِ سفر لیے
ہر گام ہم سفر کی طرح ساتھ ہم رہے
طوفانِ حادثات کی پروا کبھی نہ کی
ہر دل شکن محاذ پہ ثابت قدم رہے

طوفانِ حادثات نے یلغار کی بہت
لیکن ستون عزم کا ٹوٹا نہیں کبھی
دیوانگی میں لاکھ قدم لڑکھڑائے ہوں
دامن مگر حواس کا چھوٹا نہیں کبھی

موسم ہو سازگار کہ ناسازگار ہو
تنہائیوں میں انجمن آرائی تم نے کی
بس یہ نہیں کہ محفلِ یاراں سجائی ہو
محفل میں روشنی بھی مرے بھائی تم نے کی

یہ اور بات ہے کہ مخالف ہوا رہی
لیکن چراغ ہم نے جلائے ہیں عشق کے
نفرت کی آندھیوں میں گھرے تھے تو کیا ہوا
نغمے تو ہر محاذ پہ گائے ہیں عشق کے

آوارگی کے دوش پہ سنجیدگی کا بوجھ
ہنس کر اٹھا لیا تو فضائیں نکھر گئیں
تم ایسے ''ہرزہ گرد'' رہے ہو کہ جس طرف
تم نے قدم بڑھا دیے راہیں سنور گئیں

ہر نامراد شام کا چہرہ سنوار کر
راتوں کے خوفناک اندھیرے نکل گئے
دہکائی ایسی آگ دلوں میں خلوص کی
سارے تعصبات کے پیکر پگھل گئے

اس زندگی کی بھید بھری دھوپ چھاؤں میں
اب تھم گئی لڑائی میں کیسے یقیں کروں
تم ''آخری پڑاؤ سے پہلے'' ہی تھک گئے
مخمور! میرے بھائی میں کیسے یقیں کروں

□□□

● ماہنامہ ''ایوانِ اردو'' نئی دہلی کے جولائی 2007، شمارے میں مخمور سعیدی صاحب کی ایک نظم ''آخری پڑاؤ سے پہلے'' شائع ہوئی تھی۔ اس نظم میں انھوں نے بڑی شدت سے اپنی تھکن، مایوسی اور افسردگی کا اظہار کیا تھا۔ اسے پڑھنے کے بعد مجھ پر بھی شدید ردِّعمل ہوا اور نتیجے میں یہ نظم ہوگئی تھی۔ (خیال)

شمس الرحمٰن فاروقی

مفکرانہ ٹھہراؤ اور استعاراتی کیفیت

مخمور سعیدی کی شخصیت مجموعۂ اضداد کہی جاسکتی ہے۔ وہ جدید شاعر ہیں لیکن پرانی فارسی پر مکمل قدرت رکھتے ہیں۔ وہ جدیدیت کے نمائندہ شعرا میں نمایاں ہیں، لیکن مشاعرے پڑھتے ہیں۔ وہ تحت لفظ سناتے ہیں لیکن مشاعروں میں بے انتہا مقبول ہیں۔ ان کے مزاج میں تفرید پسندی ہے، لیکن وہ یاروں کے یار بھی ہیں۔ کبھی کبھی خیال گزرتا ہے کہ ایسے شخص کا کلام بھی مختلف مزاجوں اور لہجوں کا نمونہ ہوگا، لیکن ایسا نہیں ہے۔ مخمور سعیدی نے کلاسیکی صلابت اور بلند آہنگی اور جذبات کی توانائی کے ساتھ نئی بات کہنے کا فن بڑی خوبی سے اختیار کیا ہے۔ پھر وہ ادب کے بارے میں سوچتے اور غور وفکر بھی کرتے ہیں۔ شاعر اپنے مجموعے کا دیباچہ آپ ہی لکھے تو طرح طرح کی افراط وتفریط کا امکان پیدا ہو جاتا ہے۔ اختر الایمان کی مثال سامنے ہے، لیکن مخمور سعیدی نے اپنے اس تازہ مجموعے (دیوار و در کے درمیاں) میں بڑی خیال انگیز باتیں بڑے سوچے سمجھے انداز میں کہی ہیں۔ مثلاً وہ کہتے ہیں۔ (صفحہ۔32)

''ہمارے یہاں غیر ادبی بنیادوں پر ادبی فیصلے صادر کرنے کا سلسلہ ترقی پسند تحریک کے ساتھ شروع ہوا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین ادب کو اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کرنا چاہتی تھی، ترقی پسند ناقدوں نے ایسے ادیبوں اور شاعروں کو آگے بڑھایا جو اپنی فنکارانہ ذمے داریاں بھلا کر کلیتاً ان کے ہم نوا ہو گئے۔''

آگے چل کر وہ جدید ادب کی اس افسوسناک صورت حال پر بھی نکتہ چینی کرتے ہیں کہ:

''آج بھی کچھ لوگ ترقی پسندوں کے بتائے ہوئے راستے پر چل رہے ہیں اور ان کی نظر نہ اس پر ہے کہ کہنے والے نے کیا کہا یا کیا لکھا، نہ اس سے کچھ سروکار کہ کیسے کہا یا لکھا؟ ان کی نظر اس پر رہتی ہے کہ کہنے والا یا لکھنے والا کون ہے؟ اور کسی کہنے یا لکھنے والے کی خوشنودی حاصل کر کے یا کسی کو ناخوش کر کے ہم کیا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔'' (صفحہ۔35)

مجھے مخمور سعیدی کی بات سے مکمل اتفاق ہے اور میں اس میں اتنا اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ آج کی صورت حال کا دوسرا افسوسناک پہلو یہ ہے کہ لوگ فنی حسن اور تکنیکی خوبیوں کی بنا پر نہیں بلکہ پی آر کے بل بوتے پر شہرتیں قائم کرنا چاہتے ہیں۔ شعر اور فکشن اور تنقید سب سے ریاض غائب ہو گیا ہے اور اس کی جگہ سعی وسفارش، دھونس اور دولت نے لے لی ہے۔

ابھی اسٹیٹس مین (Statesman) میں ایک مضمون میں نے پڑھا کہ تجارتی فرمیں اور کمپنیاں اپنی پریس کانفرنسوں میں شرکا کو تحفے تقسیم کرتی تھیں، اب اس کی جگہ رواج ہے کہ گفٹ کوپن کی طرح نقد نامے تقسیم کیے جاتے ہیں کہ ان کی قیمت سے آپ اپنی پسند کی چیز کسی مقررہ دکان سے خرید سکتے ہیں۔ بعض اوقات لوگ ان نقد ناموں کو بنے پر بیچ کر رقم کھری کر لیتے ہیں۔ تو جب کروڑوں کا بزنس کرنے والی کمپنیوں کا یہ حال ہے تو بے چارہ اردو ادیب اگر دوسروں سے اپنے بارے میں کتاب لکھواتا ہے یا مراسلے بھجواتا ہے، یا نقادوں اور بااثر لوگوں کی دعوتیں کرتا ہے تو کیا گناہ کرتا ہے؟ مخمور سعیدی کے مزاج میں درویشی ہے، وہ ان باریکیوں سے بے خبر صرف عرضِ ہنر کیے جا رہے ہیں۔ کاش ان کی طرح کے دو چار لوگ ہمارے معاشرے میں اور ہوتے۔

مخمور سعیدی کے بارے میں میرا خیال تھا کہ ان کی غزل میں جو پختہ کارانہ رنگ روپ، مفکرانہ ٹھہراؤ، اور استعاراتی کیفیت ہے، وہ ان کی نظم میں نہیں۔ ''دیوار و در کے درمیاں'' نے میرا یہ خیال غلط کر دیا ہے۔ مخمور سعیدی کی نظم میں اب وہ ارتکاز، کم گوئی میں کثیر المعنویت اور شدت احساس کے ساتھ ساتھ بالواسطگی نظر آنے لگی ہے جو جدید نظم کو گزشتہ نسل کی نظم سے الگ کرتی ہے۔ مخمور سعیدی نے ابہام اور علامت کی راہ کم کم اختیار کی، اس لیے موضوعات کے اختلاف کے باوجود ان کی نظم میں ترقی پسند لہجے کی جھلک تھی۔ اب بھی انھوں نے استعارے اور علامت کو پوری طرح نہیں اختیار کیا ہے، لیکن اس کی جگہ زیر لب خود کلامی اور دروں بینی میں تفکر کا رنگ گہرا ہو گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ کلاسیکی غزل کے ماحول اور مضامین سے استفادہ بعض جگہ بڑی خوبی سے نظر آتا ہے۔ غالب کا شعر بہت لوگوں کو یاد ہوگا:

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

اور میر کا یہ شعر بھی کئی لوگوں کی زبان پر ہوگا:

گل یادگار چہرۂ خوباں ہے بے خبر
مرغ چمن نشاں ہے کسو خوش بیان کا

لیکن ناسخ تو شاید کسی کو یاد نہ ہوں:

ہو گئے دفن ہزاروں ہی گل اندام اس میں
اس لیے خاک سے ہوتے ہیں گلستاں پیدا

تقریباً ڈھائی سو برس کی شعری مشق یا عمل Praxis کے باوجود اچھا شاعر اس بات کو کس کیفیت، وفور جذبات سے عاری لیکن محزونی اور تمنا سے پُر لہجے میں بیان کر سکتا ہے، یہ معلوم کرنا ہو تو مخمور سعیدی کی نظم پڑھیے جو انھوں

نے اپنی مرحوم اولادوں اور بھتیجی کی یاد میں لکھی ہے۔ عنوان ہے ''موسم بہار کی ایک نظم''، بائیس مصرعوں کی نظم سے میں آخری نو مصرعے نقل کرتا ہوں:

پتّیوں پہ شگفتگی کا عالم
اس دل کے بھی سارے داغ تازہ
یادوں کی تماز تیں سنبھالے
سایہ سایہ بھٹک رہا ہوں
ان برگ و گل و ثمر میں شاید
اسلم کہیں لہلہا رہا ہو
سیما کہیں مسکرا رہی ہو
یا آصفہ تتلیاں پکڑنے
آئی ہو، کہیں مچل رہی ہو

میں سوچتا ہوں اگر سارا ئیو کے قبرستان میں کبھی بہار آئی تو بوسنیا کے مظلوم شہید بچوں کے والدین شاید کچھ ایسی ہی زبان میں گفتگو کریں گے۔

لیکن مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ غزل میں مخمور سعیدی اپنی پوری تخلیقی قوت صرف کر دیتے ہیں۔ ان کی غزل نک سک سے درست تو ہوتی ہی ہے، اس میں الفاظ اور مصرعوں کا دروبست عام طور پر غیر معمولی تو ہوتا ہی ہے، بڑی بات یہ ہے کہ ''دیوار و در کے درمیاں'' کی غزلوں میں جو پختگی، آسانی سے بات کہنے کی ادا، اور آزاد روانی ہے وہ مخمور سعیدی کا اپنا کارنامہ ہے، اس پر کسی معاصر غزل گو کی پرچھائیں نظر نہیں آتی:

حاصلِ عشق کیا کہیں مخمور
ہاتھ آیا ہے بے مثال سا کچھ

اسے احمد مشتاق کے شعر سے ملا کر دیکھیں تو دونوں کی انفرادیت کھلتی ہے:

جمع و تفریق سے ہے دشتِ تمنا خالی
حاصلِ شوق وہی ہے جو ہوا کھائی ہے

احمد مشتاق کے یہاں فریب شگفتگی اور عشق و عاشقی و معشوقی سب پر ہنسنے اور سب کا احترام کرنے کی ادا ہے۔ مخمور سعیدی کے شعر میں اسرار اور مابعد الطبعیاتی گہرائی ہے جو اور کسی کو اس طرح نصیب نہیں ہوئی:

کیا دل سے مٹے اب خلشِ ترکِ تعلق
کر گزرے وہ ہم جو کبھی سوچا بھی نہیں تھا
جو چل پڑے ہیں کشتیِ موجِ رواں لیے
چادر ہوا کی ان کے لیے بادبان ہے

منتظر اے مخمور بہت دن سے میں اسی آواز کا تھا
اس کا بلاوا آ پہنچا ہے خود سے رخصت ہولوں میں

کوئی بے کراں سمندر کو عبور کر سکا ہے؟
تری ناؤ جو ڈبو دے وہی موج تیرا ساحل

موڑ کچھ بے تعلقی کے بھی
رہگذارِ تعلقات میں ہیں

کچھ زور ہوا کم ہو تو رُک کر کہیں دم لیں
پرواز کی شدت سے یہ بے جان پرندے

سفر اور گذران، وقت کا یا تعلقات کا، یہ مخمور سعیدی کے خاص استعارے ہیں۔ ان کے کلام میں رسائی کو نارسائی کے ذریعے ظاہر کرنے اور ملاقات کو بچھڑنے سے تعبیر کرنے کا انداز محض رومانی محزونی نہیں بلکہ کائنات میں انسان کے وجود کا استعارہ ہے:

مانوس فقط رسم و رہِ عام سے دنیا
دل بے خبر رسم و رہِ عام ہمارا

مخمور سعیدی اب عمر کی اس منزل میں ہیں جہاں لوگ ٹھہر جانے ہی میں عافیت سمجھتے ہیں۔ ان کے اکثر معاصر ٹھہر گئے بھی ہیں لیکن زیرِ مجموعہ مخمور سعیدی کی مسلسل اور فعال ترقی کا ثبوت دے رہا ہے اور یہ بڑی خوش آئند بات ہے۔

(بشکریہ ''شب خون''، اگست-1995)

□□□

''اردو دنیا'' کے مضمون نگاروں سے گزارش

- بات پوری وضاحت سے کہیں لیکن عبارت آرائی سے گریز کریں۔
- ''اردو دنیا'' میں ایسے مضامین کی اشاعت کو ترجیح دی جاتی ہے جو عصری زندگی کے کسی اہم پہلو پر روشنی ڈالتے ہوں۔
- زبان آسان اور عام فہم استعمال کریں اور اختصار کو ملحوظ رکھیں۔
- بچوں کے کالم کے لیے کہانی یا مضمون کم سے کم 2000 الفاظ پر مشتمل ہو۔
- غیر طلبیدہ مضامین ناقابلِ اشاعت ہونے کی صورت میں تبھی واپس ہو سکیں گے جب ان کے ساتھ مناسب سائز کا ٹکٹ لگا لفافہ موصول ہو۔

—ایڈیٹر

رشید حسن خاں

ذہن کا سفر

1947 سے پہلے کا زمانہ ہے۔ راجستھان کے علاقے میں ایک ریاست ہے جو رقبے میں چھوٹی اور خوش حالی میں کم درجہ سہی، لیکن شہرت کے لحاظ سے ہیٹی نہیں۔ ہر ریاست کی طرح یہاں بھی اشراف کا ایک چھوٹا سا طبقہ موجود ہے۔ جس کے پاس علم بھی ہے اور دولت بھی۔ وہ تہذیبی روایتوں کا امین بھی ہے اور معیار بھی۔ یہاں زندگی پرسکون ہے اور اس کے مطالبے بھی محدود ہیں۔ ملک میں سیاسی طوفان بپا ہیں لیکن بعض اور ریاستوں کی طرح اس جزیرے تک ابھی اس بھونچال کی لہریں نہیں پہنچ پائیں۔ عام لوگ غریب سہی لیکن تقدیر پر شاکر ہیں۔ ان کے ذہن مطالبات کی تلخی سے ابھی نا آشنا سے ہیں اور ان کی زندگی، راحتوں کے ان تصورات سے بےگانہ بھی ہے جن کے حصول کے لیے کوہ کنی کرنا پڑتی ہے۔ مجبوریوں نے قناعت کا سبق پڑھایا ہے اور صبر وشکر کے ساتھ زندگی گذارنا شرافت کا معیار بن گیا ہے۔

پٹھان خاندان میں ریاست کی حکمرانی چلی آ رہی ہے اور اس عہد کے پٹھانوں کی خصوصیات: غیرت، ضد، جہالت، بے ریائی اور مذہبیت سے یہ طبقہ بھی گراں بار ہے۔ شعر گوئی یہاں تہذیبی ضرورت معلوم ہوتی ہے اور شعر فہمی مجلسی زندگی کا حصہ ہی نہیں، اس دائرے میں بیٹھنے والوں کے علم وفہم کا معیار بھی ہے۔ ریاست خواہ اور چیزوں سے محروم ہو لیکن اس کی فضائیں شعر وادب کے ترانوں سے معمور ہیں۔ ریاست کا حکمراں بھی سخن گوئی اور سخن فہمی سے بے گانہ نہیں۔ اور چیزوں کی طرح شعر گوئی اور شعر وادب کی سرپرستی بھی اس کو ورثے میں ملی ہے۔ اسی خاندان کا ایک معروف فرد مرزا غالب کا ممدوح اور ان کی توقعات کا مرکز رہ چکا ہے۔

مکتبی تعلیم عام ہے۔ عربی فارسی میں دست گاہ پیدا کرنا سب سے پہلی اور عموماً سب سے آخری ضرورت سمجھی جاتی ہے۔ ہر چیز کو وہ شاعری ہو یا تہذیبی زندگی کے اور مظاہر، کلاسکیت کے ٹھپا لگے ہوئے معیار پر جانچا پرکھا جاتا ہے۔ قدامت کی دھوپ ہر طرف پھیلی ہوئی ہے اور قدیم وجدید کی کش مکش کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔

اس ریاست کو سر سبزی وشادابی کے لحاظ سے سادہ کہا جا سکتا ہے۔ یہاں ریت کے میدان ہیں، پہاڑی ٹیلے ہیں اور کچے پکے مکانات۔ ہر طرف اس انداز کی سادگی چھائی ہوئی ہے جو تمدن کے تصنع سے پہلے کی چیز ہوتی ہے۔ ہاں آنکھوں میں شرافت اور غیرت کی بجلیاں کوندتی ہوئی ضرور نظر آتی ہیں اور خودداری وحمیت کی آگ دلوں میں روشن ہے۔ سادگی کے ساتھ کشادہ دلی کی وقعت عام ہے اور یہ سارے الفاظ معانی کے ساتھ یہاں ملتے ہیں۔ مذہب کا اثر گہرا ہے۔ حضرت سید احمد شہید کی تحریک میں یہاں کے حکمراں اور عوام نے دل کھول کر مدد دی تھی اور اس تحریک کی ناکامی کے بعد مجاہدین کا ایک گروہ مستقل طور پر یہاں بس گیا تھا۔ اب شاید یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہوگی کہ یہ مرحوم ریاست ٹونک کا ذکر ہے۔

امرا اور صاحب استطاعت طبقے میں، نئی عمر جب آنکھیں کھولتی ہے تو اس کو ہر طرف قدامت اور کلاسکیت کا نور پھیلا ہوا نظر آتا ہے۔ ہر جگہ شاعری کی محفلوں کے چرچے ہیں، اور زبان اور محاورہ، روزمرہ اور حسن ادا کے تذکرے ہیں۔ داغ کی شاعری کی دھوم مچی ہوئی ہے۔ مضطر خیر آبادی کے اشعار پر لوگ جھوم رہے ہیں اور لفظوں کے نگینے جڑنے کی داد دی جا رہی ہے۔ زندگی کے ساتھ جو رویہ ہے وہی شاعری کے ساتھ روا رکھا جاتا ہے۔ گہرائی اور پیچیدگی سے بےتعلقی، سطح اور سادگی سب کچھ—— ذہن سب سے پہلے ان ہی محرکات کو جذب کرتا ہے اور شعور کی سطح سب سے پہلے ان ہی نقوش سے مزین ہوتی ہے۔ آغاز شعور وابتدائے فکر کے یہ نقوش اس قدر دیرپا ہوتے ہیں اور ان محرکات کے اثرات اس قدر تہہ نشین کہ آئندہ زندگی کے بہت سے انقلابات بھی ان کے اثرات کو کلیتہً ختم نہیں کر پاتے۔ ذہن کے آئینہ سادہ وصاف کو مستقبل کی زندگی کے تغیرات دھندلا دیا کرتے ہیں لیکن اس کے جوہروں کو فنا نہیں کر پاتے۔ جن لمحوں میں وہ دھندلاہٹ ذرا بھی صاف ہوتی ہے، ان میں اصلی جوہر تڑپ کر فوراً ہی نمایاں ہو جاتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ دھندلاہٹ اور یہ تابانی مستقل کش مکش کا سلسلہ بن کر رہ جاتی ہے جس کا سب سے طاقت ور مظاہرہ شاعری میں رونما ہوتا ہے۔

اس ریاست اور اس ماحول میں ایک نوجوان نوعمری کی منزلیں طے کر رہا ہے۔ وہ ایک ایسے گھرانے میں پیدا ہوا ہے جو صاحبزادگان کا گھرانہ کہلاتا ہے یعنی حکمران خاندان سے تعلق رکھنے والا۔ یہ خاندان ان تمام خصوصیات سے گراں بار ہے جو اُس طبقہ کا سرمایہ ہوا کرتی تھیں۔ گھر میں عیش وعشرت نہ سہی فرصت اور فراغت ضرور ہے۔ خاندان کا سب سے زیادہ قابلِ ذکر سرمایہ وہ چند تلواریں ہیں جو گھر میں پرانی عزت کی طرح احتیاط کے ساتھ رکھی ہوئی ہیں اور جن کو دیکھ کر اور جن کا نام لے کر خاندان کے وقار کا ذکر شروع ہوتا ہے۔ اس نوجوان کی نظر میں وہ ہمیشہ چمکتی رہیں لیکن ہاتھ تک نہیں پہنچیں یا ہاتھ ان تک نہیں پہنچا۔ جو آب وتاب اُن تلواروں میں ہے اس سے زیادہ آب داری ان

بزرگوں کی آنکھوں میں ہے: پٹھانی خاندان کے پُر وقار چہرے اور پُر جلال آنکھیں ماضی کے ذکر کے ساتھ ہی جن میں چراغ جل اُٹھتے ہیں۔

مکتب سے تعلیم کا آغاز ہوا جہاں خالص قدیم انداز سے فارسی پڑھائی جاتی تھی۔ ایسی تعلیم جس کا مقصود ومنتہا کسی امتحان میں کامیابی حاصل کرنا نہیں، اصل مقصد ہے کتاب کو پورے مشتملات کے ساتھ ذہن میں محفوظ کر دینا۔ تعلیم کا نہایت محدود تصور لیکن اس محدود دائرے کے اندر کوئی چیز دسترس سے باہر نہیں رہ پاتی۔ اور یہ وہ خوبی ہے جس پر زبان وادب کی جدید پُر مقاصد تعلیم کو رشک آجانا چاہیے۔ تعلیم کے ساتھ ہی تربیت کا آغاز بھی ہو جاتا ہے جس میں پابندیوں پر سب سے زیادہ زور ہے۔ بندشیں اور محض بندشیں سمجھے بغیر اور سمجھنے کی کوشش کیے بغیر جن کی پابندی لازم ہے۔

فضا شعر وسخن کے نغموں سے گونج رہی ہے۔ محفلیں اسی گفتگو سے روشن ہیں۔ گھر میں بھی شاعری کا چرچا ہے۔ وہی پرانے انداز کی شاعری، زبان، محاورے اور صنائع بدائع کی شاعری۔ یہ نوجوان بھی اس طرف توجہ کرتا ہے گرد وپیش کی ادبی روایتوں کی رعایت سے، صحت الفاظ، قافیہ، ردیف، محاورہ وروز مرہ اور حسنِ بیان کے محاسن پر توجہ مبذول ہوتی ہے۔ قدیم ماحول اور قدیم انداز سخن کی روایتوں کے حصار میں تربیت پایا ہوا یہ نوجوان اسی راستے پر گامزن ہو جاتا ہے۔ ذہن میں جودت ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ طبیعت میں ایک طرح کی سیمابیت بھی ہے۔ ذہن اپنا کام کر رہا ہے۔ زندگی متعین راستوں پر چل رہی ہے لیکن ایک بے نام سی خلش ہے جو کبھی کبھی طبیعت کو پریشان کرتی ہے۔

اب وہ منزل آگئی ہے جب نوجوانی کے قدموں کی آہٹ کچھ تیز ہو جاتی ہے۔ طبیعت کی بے قراری اچانک شوریدگی کا سامان مہیا کر دیتی ہے اور بے اختیاری اس سادہ و بے رنگ علاقے سے نکال کر دہلی کی پُر شور فضا میں پہنچا دیتی ہے۔ سن 1952-1953 کے قریب کی بات ہے۔ ملک تقسیم ہو چکا ہے۔ زندگی کو یا بدل سی گئی ہے۔ ہر طرف بھاگ دوڑ ہے۔ ہر شخص کسی جستجو میں رواں دواں ہے۔ کسی کو دوسرے کا حال پوچھنے کی فرصت نہیں۔ مروت، وضع داری، ہم دردی، ایثار کے جو لفظ فارسی کی پرانی کتابوں میں پڑھے تھے اور جن کے معنی اس چھوٹی سی ریاست کے افراد کے طرزِ عمل میں پائے جاتے تھے وہ سب یہاں بدلے ہوئے نظر آئے۔

زندگی کی طرح ادب کی دنیا بھی بدلی ہوئی ملی۔ نئی زندگی کے پیچ وخم نے ہر بات کو الجھا دیا۔ سادگی وصفائی، دور کی آواز معلوم ہوتی ہے۔ شاعری پر نئے تجربات کی پرچھائیاں پڑ رہی ہیں۔ اس کا انداز ہی نہیں بدلا ہے معیار بھی بدل گیا ہے۔

اندھیرے کی بات کیا ہے، کم روشنی سے نکل کر اچانک تیز روشنی کی زد پر آجایئے تو آنکھیں بند ہو جائیں گی۔ جن روایتوں کے گہوارے میں آنکھ کھلی تھی اور جن کے زیر سایہ شعور کی انگلی پکڑ کر چلنا سیکھا تھا وہ اچانک ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئیں۔ نہ خاندانی وقار نے ساتھ دیا نہ نسلی افتخار کام آیا۔ اس نئی دنیا میں ان سکّوں کا چلن ہی نہیں تھا۔ آنکھیں محو حیرت تھیں اور دل اداس لیکن فطرت نے اس نوجوان کے مزاج میں بلا کی لچک رکھی تھی اور شعر میں بلا کی قوت مفاہمت پنہاں کر دی تھی کہ آنکھیں جھپکانے کے بجائے اس نے اس نئی زندگی سے بھی اسی طرح آنکھیں چار کیں۔ نئی روایتوں کے آب ورنگ کو دیکھنا پرکھنا اور قبول کرنا شروع کر دیا۔ ایک زمانے میں اس نوجوان کا نام سلطان محمد خاں تھا آج ہم اس کو مخمور سعیدی کے نام سے جانتے ہیں۔

اس نئے دیار میں آتے ہی، سب سے پہلا سابقہ کش مکش سے پڑا: ذہنی کش مکش۔ جس قدر دن گذرتے گئے اس کش مکش کے اثرات میں اضافہ ہوتا گیا۔ قدیم انداز معاشرت اور ایک محدود دنیا میں پرورش پایا ہوا ذہن جدید صنعتی زندگی کی بخشی ہوئی بے نیازیوں سے دوچار ہوا۔ پرانے انداز کی وضع داریاں، اخلاص، مروت، فرصت کے دن اور کہانیوں کی راتیں یہ سب ادھورے خواب معلوم ہونے لگے۔ خوابوں کی شکست نے تہہ نشین انداز سے جدید زندگی کے آداب واطوار کی طرف سے بدگمان کرنا شروع کیا۔ لیکن ان نئے طریقوں میں ایسی کہکشاں بھی پنہاں تھی جس کا اس سے پہلے خواب بھی نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ ذہن کشاکش کی آماج گاہ بن کر رہ گیا۔ نئی زندگی کی فیض بخشیاں دامن دل کو کھینچتی تھیں اور جب اس قدیم تربیت یافتہ ذہن ومزاج کے پندار پر کہیں سے کوئی ضرب پڑتی تھی یا محرومیوں کے ہجوم سے آنکھیں چار ہوتی تھیں تو اچانک ماضی کی وہ دنیا یاد آنے لگتی تھی، جہاں ہنگامے محو خواب تھے اور جہاں تصادم و پیکار کا یہ دل دوز اور صبر آزما کاروبار نہیں تھا۔ یہ ردّعمل زیادہ طاقت ور تھا اور پیہم اثرات نے اس زندگی کی طرف سے پیدا ہو جانے والی بدگمانیوں کو ذہن سے دور نہیں ہونے دیا۔ ماضی کی یاد آتی ہے اور بار بار آتی ہے: کبھی ڈوبتی ہوئی رات کی شکل میں، کبھی لفظوں کے ایلیے کی صورت میں اور کبھی ویران در وبام کی خاموشی کے ہجوم میں۔ اس یادِ ماضی اور ذہنی بازگشت کی تکرار کی وجہ یہی ہے کہ پچھلی تربیت کے نقش ذہن سے محو نہیں ہو پاتے۔ نئی زندگی سے عملی سطح پر تو سمجھوتہ ہے لیکن ذہنی سطح پر اس سے بدگمانی کم نہیں ہوتی۔

مخمور کے کلام میں یادِ ماضی کا ذکر بار بار ہے اور صورتیں بدل بدل کر آتا ہے۔ اس پیہم تکرار کی وجہ یہی ہے کہ یہ شخص حال سے غیر مطمئن ہے اور یہ عدم اطمینان کسی سیاسی یا فلسفیانہ اندازِ فکر کا نتیجہ نہیں۔ جس میں جان کم اور فکر زیادہ ہوتی ہے۔ مخمور کے یادِ ماضی میں اس تہذیب سے بے پناہ عقیدت کا دخل ہے جس کے سائے میں ذہن نے نشو ونما پائی ہے۔ اس لیے ایسی نظموں میں جذبے کی شدت کارفرما ہے جس کے اثر سے ان نظموں میں بلا کی تاثیر سما گئی ہے اور پڑھنے والے کا ذہن قدیم وجدید کی سماجی ناگزیر تقسیمات کو کچھ دیر کے

لیے فراموش کر کے شاعر کا ہم نوا بن جاتا ہے۔ یہی تاثیر کا مدعا ہے اور یہی جذبے کا تقاضہ ہے۔

معاشی بے اطمینانی کے اثر سے غلط بختیاں کب نہیں تھیں۔ اُس زمانۂ مرحوم میں شاید ان کا تناسب کچھ زیادہ ہی تھا لیکن اب ان چیزوں کا احساس زیادہ شدت کے ساتھ ہوتا ہے اور چوں کہ نجات کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا، اس لیے، یادِ ماضی اور ستاتی ہے اور حال سے بے اطمینانی بڑھ جاتی ہے۔ یہ عدم اطمینان شخصی کم اور تہذیبی زیادہ ہے۔ طرزِ فکر ضرور بدلا ہے لیکن ذہن وہی ہے انداز بھی بدلا ہے لیکن آنکھیں وہی ہیں۔ حال کا بھرپور احساس ہے اور نئی تبدیلیوں اور نئے تقاضوں کا عرفان واعتراف تو ہے مگر ایک مسلسل بے چینی بھی ہے: ادب اور تہذیب دونوں کی سطح پر۔ ادبی تبدیلیوں کو تو ذہن نے قبول کر لیا ہے لیکن اخلاق و اقدار کی تبدیلیوں کو وہ ابھی تک قبول نہیں کر سکا ہے۔ مخمور کی شاعری کا اچھا خاصہ حصہ ان اثرات کا آئینہ خانہ ہے جس میں بار بار ان عکسوں کی چمک دکھائی دیتی ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ چوں کہ ان خیالات میں ذاتی تاثر شامل ہے، ان کی بنیاد بھی ذاتی احساسات پر ہے اور یہ دل کی گہرائیوں سے ابھری ہوئی وہ موجیں ہیں جن میں فکر سے زیادہ جذبے کا اثر ہے، اس لیے، ان نظموں میں تاثیر کی گرمی بھی ہے اور دل دوزی کی کسک بھی۔ کلاسیکی ادب کے مطالعے اور زبان کی بنیادی مکتبی تعلیم کے اثر سے لفظوں کی مزاج شناسی اور حسنِ ادا کی شناسائی کا جو ملکہ مخمور کے مزاج کا جز بن چکا ہے اس کے اثر سے شدتِ تاثر کے ساتھ ساتھ طرزِ اظہار کی دل کشی بھی سموئی ہوئی نظر آتی ہے اور ان عناصر نے اس کی شاعری میں بلا کی دل فریبی پیدا کر دی ہے کہ پڑھنے والے کا ذہن خواہ وہ سیاسی طور پر فکرِ شاعر کا ہم نوا نہ ہو اور خواہ اس کے ذہنی تاثرات اس سے بالکل مختلف ہوں یا وہ اس کش مکش کے علم و احساس سے پوری طرح باخبر نہ ہو لیکن جذبے کی شدت اور بیان کا حسن اس کو لاشعوری طور پر شاعر کا ہم نوا بناتا ہوا گذر جاتا ہے۔

یاد پھر بھولی ہوئی ایک کہانی آئی
دل ہوا خون طبیعت میں روانی آئی
صبحِ نو نغمہ بلب ہے مگر اے ڈوبتی رات
میرے حصہ میں تری مرثیہ خوانی آئی
ہر نئی رت میں ہم افسردہ و دل گیر رہے
یاد گذرے ہوئے موسم کی جوانی آئی
پا گئے زندگی نو کئی مٹتے ہوئے رنگ
ذہن میں جب کوئی تصویر پرانی آئی
خشک پتوں کو چمن سے یہ سمجھ کر چن لو
ہاتھ شادابیِ رفتہ کی نشانی آئی

شادابیِ رفتہ پلٹ آئے تو عجب کیا
گزرے ہوئے موسم کو پھر ایک بار پکاریں

قدیم تہذیبی اقدار کے ساتھ، پرانی معنویت سے گراں بار بہت سے الفاظ بھی گویا مرحوم ہوتے جا رہے ہیں۔ لفظوں کے پیکر تو وہی ہیں، ان کے معانی بدل گئے ہیں۔ نہ معلوم کتنے لفظ ہیں جن میں تقسیم ملک سے پہلے کی تہذیبی دنیا کے مفاہم پنہاں ہیں لیکن اب ان خیموں کی طنابیں اکھڑ رہی ہیں۔ ان تصویروں کے رنگ اڑے جا رہے ہیں اور یہ ستارے ڈوب رہے ہیں۔ شاعر کو اس کا شدید غم اس لیے ہے کیوں کہ وہ ہر لفظ میں پرانی تہذیب کی جلوہ گری دیکھتا ہے اور ہر لفظ کی موت اس کے لیے ایک تہذیبی مظہر کی موت ہے۔ کیا درد ہے اس اظہار میں:

نئے نئے لفظ شور کرتے
بڑھے چلے آ رہے ہیں
فکر و خیال کی رہگذار آباد ہو رہی ہے
زباں بہت سی پرانی حد بندیوں سے آزاد ہو رہی ہے
کئی فسانے جواں کیے تھے، کئی تصور جو بے زباں تھے
ہزار عالم نشاط و غم کے جو پہلے نا قابلِ بیاں تھے
وہ دھڑکنیں خامشی کی جن کے خروشِ پنہاں کی ترجماں تھی
وہ نغمگی جو خموشیوں کے سیاہ زنداں میں پُرفشاں تھی
اسے اب آخر کھلی فضاؤں میں اذنِ پرواز مل گیا ہے
کہ اک نیا رشتہ درمیانِ خیال و آواز مل گیا ہے
مگر مجھے چپ سی لگ گئی ہے
نئے نئے لفظ شور کرتے بڑھے چلے آ رہے ہیں— اور میں
ہجومِ پُرشور میں اکیلا
پرانے لفظوں کو ڈھونڈھتا ہوں
یہ دیکھتا ہوں
جہاں جہاں کل پرانے لفظوں نے ڈال رکھے تھے اپنے ڈیرے
وہاں نئے لفظ آ کے آباد ہو گئے ہیں
مکاں اگر چہ اُجڑ نہ پائے، مکین برباد ہو گئے ہیں
نئے نئے لفظ شور کرتے بڑھے چلے آ رہے ہیں... لیکن
پرانے لفظوں کی پائمالی نے دم بہ خود کر دیا ہے مجھ کو
کسی نے سوچا نہیں ہے شاید، مگر میں اکثر یہ سوچتا ہوں
پرانے لفظوں کے ساتھ ہی اک پرانی دنیا بھی کھو گئی ہے
خموشیوں کے سیاہ زنداں میں جا کے روپوش ہو گئی ہے
(لفظوں کا المیہ)

اس نظم میں سب سے اہم عنصر ماضی کے احساس کا ہے۔ شاعر کو اس کا پوری طرح اندازہ ہے کہ زبان بہت سی حد بندیوں سے آزاد ہو رہی ہے، خیال و آواز کو نیا رشتہ مل رہا ہے اور بہت سے بے زبان تصورات کو آج زبان مل گئی ہے۔ وہ ان کی اہمیتِ ناگزیر کا معترف تو ہے، مگر انھیں زندگی کا لازمی اور ایسا نتیجہ بھی سمجھا ہے جسے بہ خوشی قبول کیا جانا چاہیے۔ اسے پرانے لفظوں کی پامالی کا بھی دکھ ہے کیوں کہ ان کے ساتھ ایک دنیا کھو گئی ہے: وہ تہذیبی دنیا جس میں اس نے آنکھ کھولی تھی اور جس میں اس کے ذہن و شعور کی نشو و نما ہوئی تھی جس کی بعض گہری دل کشیوں کا وہ آج بھی معترف ہے اور جن کا بدل اسے آج کی دنیا میں نظر نہیں آتا۔ یہ توازن ہی اصل میں مخمور کی شاعری کی جان ہے اور اسی کے فیض سے فکر و اظہار دونوں میں انتہا پسندی جگہ نہیں لے پائی ہے۔ اس توازنِ فکر و احساس نے ساری شکستوں کے باوجود، ذہن پر اس منفی اندازِ نظر کو غالب آنے نہیں دیا ہے جس میں آج کے بہت سے نارسیدہ شاعر مبتلا ہیں۔ دوسری طرف ماضی کی پسندیدگی کو بھی پرستش میں شامل نہیں ہونے دیا نیز اظہار کی سطح پر نئے عناصر کو جذب کرنے کے ساتھ ساتھ حسنِ بیان کے کلاسیکی عناصر کو بھی کارفرما رکھا ہے۔

کہا گیا ہے کہ اچھے سوانح نگار کے اندر تھوڑی سی ہم دردی بھی ہونا چاہیے۔ اس کے بغیر وہ انصاف نہیں کر سکے گا۔ ماضی سے یہ ہم دردی مخمور کے یہاں نہ صرف اس طرح پائی جاتی ہے کہ اس کو ماضی سے محبت ہے، اس کے مٹنے کا غم بھی ہے، وہ اس پر گہرے دکھ کا اظہار بھی کرتا ہے بلکہ اس کا ماضی خوش گوار اور مستقبل کا علامیہ بھی ہے۔ وہ حال سے بیزار نہیں ہے، وہ زندگی کے نئے آداب کو مانتا ہے اور ان پر اصرار بھی کرتا ہے اور جہاں بھی وہ محسوس کرتا ہے کہ ماضی حال کے راستے کا پتھر بن جانا چاہتا ہے وہاں اس سے واضح اختلاف کا اظہار کرنے میں بھی تامل نہیں کرتا۔

چند سائے ہیں کہ ہر رہ گذرِ ہستی پر
خود سے مائل بہ تخاطب نظر آتے ہیں مجھے
ان سے بچ کر میں گذرتا ہوں تو کتنے ہی قدم
جیسے سرگرمِ تعاقب نظر آتے ہیں مجھے
چند چہرے ہیں کہ ماضی کی کمیں گاہوں میں
حال کے مالک و مختار بنے بیٹھے ہیں
منصب ان کا مجھے پیہم یہ جتاتے رہنا
کون سی وضع بری کون سے طور اچھے ہیں
چند آنکھیں ہیں کہ جو مجھ پہ جھکی رہتی ہیں
کیف و کم ان کا بھلایا تو نہیں ہے میں نے
ان سے پایا ہوا پیمانۂ تعمیرِ حیات
جیتے جی اپنے گنوایا تو نہیں ہے میں نے
دورِ رفتہ کا یہ خمیازۂ ناحق کب تک
جامِ امروز مجھے کیوں نہیں پینے دیتے
اپنے وقتوں کے خوش اوقات، خوش انجام یہ لوگ
میرے وقتوں میں مجھے کیوں نہیں جینے دیتے

(زندانی)

خلوص، ذاتی تاثرات اور جذباتی احساس ہر اچھے شاعر کا سرمایۂ فخر ہوا کرتا ہے۔ جس کی جلوہ گری مخمور کے تخلیقی سفر کی بنیاد ہے۔

جس تبدیل شدہ منظرنامے کا میں نے ذکر کیا اس میں معاشی بدحالی عام ہے۔ بہت سے خوابوں کی شکست اسی کا نتیجہ ہے۔ لیکن یہ عام مسئلہ بھی مخمور کے یہاں ذاتی تجربے اور واردات کے رنگ میں ڈوب کر نمایاں ہوتا ہے۔ نوجوانی میں اپنے وطن سے بچھڑا ہوا ایک فرد، ایک مدت تک ہنگامہ آفریں اور قسمت کو بدلنے والے شہر میں قسمت آزمائی کرنے کے بعد، بے شمار قسمت آزماؤں کی طرح خالی ہاتھ وطن لوٹنے پر مجبور ہے۔ اس مدت میں اس چھوٹے سے شہر میں ویرانیاں اور بڑھ چکی ہیں، قسمت کی لکیریں اور زیادہ مدھم ہو گئی ہیں اور یادوں کے آئینہ خانے، گردشِ ایام کے غبار سے پوری طرح دھندلا چکے ہیں۔ یہ ساری داستان اس کی نظم 'گھر' میں بیان ہوئی ہے۔ اس نظم کا حسن اس کی دل دوز تاثیر میں پنہاں ہے اور وہ تاثیر اس وجہ سے زندہ و تابندہ ہے کہ شاعر نے عام نقطۂ نظر یا عام معاشی و سماجی حقائق کو نظم نہیں کیا ہے، اس نے ایک منظر کو خود دیکھا ہے، اس کے ذہن نے جو کچھ سوچا ہے اسی کو جذبۂ شعری نے لفظوں میں منتقل کر دیا ہے۔ نظم میں ایک فرد کی نامرادی کی کہانی ہے لیکن حقیقت میں وہ اس عہد کی معاشی اور معاشرتی المیے کی داستان ہے۔ بس خوبی و تاثیر اس وجہ سے بڑھ گئی ہے کہ شاعر نے جب تک اس کو خود محسوس نہیں کیا ہے، اس صورتِ حال سے وہ خود دوچار نہیں ہوا ہے، اس وقت تک اس نے کچھ نہیں کہا ہے۔ اس سے شاعر کے اندازِ فکر اور طریقِ کار کا بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ دراصل تاثرات کا شاعر ہے کہ عام المیوں کو مسلمہ سیاسی یا سماجی مسائل کی حیثیت سے اس وقت تک وہ شاعری کا موضوع نہیں بناتا جب کہ جذبے کی شدت ان کو واردات سے قریب نہ کر دے۔ پرانے در و دیوار، پرانے وطن اور پرانی یادوں کے دھندلے چہرے اس سے ہم کلام ہیں۔ وہ ایک عمر کے بعد آیا ہے، شعور کی دولت بڑھ چکی ہے، لیکن سونے چاندی سے دامن خالی ہے۔ یہ نظم صرف شاعر کی سرگذشت نہیں، اُس عہد کے ذہین طبقے کے ایک گروہ کی عمومی دردناک داستان بھی ہے جو ذہانت سے مالا مال ہے لیکن دنیا کے حصول میں کامیاب نہیں۔ یہ کہانی روداد

جہاں معلوم ہوتی ہے۔ ہاں ضمنی طور پر، یادِ ماضی کا جو رجحان مخمور کے یہاں ایک بنیادی عنصر کی حیثیت سے کام کرتا رہتا ہے اس کے تہہ نشین اثرات اس نظم میں بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ بہت پُر تاثیر اور درد آفریں نظم ہے۔

گھر سے چپکے سے نکل بھاگا تھا جو اک رات کو
یہ وہی نادان سا لڑکا ہے، یہ مانے گا کون
تجربے کیوں کر بدل دیتے ہیں شکل انسان کی
تم پہ کیا گزری ہے اتنے روز تک، جانے گا کون
مدتوں بعد آئے ہو جن دوستوں کو ڈھونڈتے
اب اگر مل بھی گئے تو تم کو پہچانے گا کون
ہم نے کب پوچھا کہ کیا سوغات لے کر آئے ہو
کیوں تہی دستی پہ اپنی تم ہو شرمائے ہوئے
ٹوکنے والا تمھیں کوئی نہیں، کوئی نہیں
تم کس اندیشے سے ہو اس درجہ گھبرائے ہوئے
اپنی صورت دیکھنے سے جن میں اب خائف ہو تم
مدتیں گزریں ان آئینوں کو دھندلائے ہوئے
یہ تمھاری مضطرب نظریں درودیوار پر
کس الجھی ہوئی گتھی کو سلجھانے میں ہیں
طاق وسقف و بام کی رنگینیاں، رعنائیاں
دفن ماضی کے طلسماتی نہاں خانے میں ہیں
تھا جن آنکھوں کو تمہاری واپسی کا انتظار
اب وہ خوابیدہ کسی گم نام ویرانے میں ہیں
تم نے سوچا گھر کی رونق کو بڑھانے کے لیے
کچھ نئی چیزیں کہیں سے ڈھونڈ کر لاؤ گے تم
اس زمیں، اس چار دیواری کی دل کش خاک کو
جب کبھی آؤ گے اپنا منتظر پاؤ گے تم
خیر مقدم کو بڑھیں گی کتنی آنکھیں، کتنے دل
ساتھ اپنے ان گنت تحفے لیے آؤ گے تم
تم نے یہ سوچا نہیں، گر دیر تم کو ہو گئی
لاؤ گے کس کے لیے سوغات اور لاؤ گے کیا؟
اس کھنڈر پر تم خوشی کے پھول برساؤ گے کیا؟
پوچھتی ہے تم سے ویرانی درودیوار کی
دو گھڑی رُک کر یہاں تم بھی چلے جاؤ گے کیا

میں اس طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ مخمور کے یہاں کرب ایک بنیادی عنصر ہے جو ان کی اکثر نظموں کی رگ و پے میں جاری نظر آتا ہے اور اس کے اثر سے ان کے یہاں ہر منظر اور ہر چیز کے ناتمام سے ہونے کا نقش ابھرتا ہے۔ یقیناً یہ سب حقائق ہیں لیکن وسعتِ فکر ونظر کے نقطۂ نظر سے یہ کوئی بہت اچھی بات نہیں کہ المیۂ انداز اظہار مستقل خصوصیت بن جائے۔ اس کا ایک اثر یہ بھی ہے کہ وہ عموماً ایسے موضوعات کا انتخاب کرتے ہیں، غیر شعوری طور پر سہی، جن کی تفصیلات میں اس عنصر کا عمل دخل خود بہ خود زیادہ ہونا چاہیے۔ مثلاً ان کی نظمیں 'گئے دنوں کی جگ مگ یادو'، 'گھبرا نہ جائے دل'، 'دستک'، 'تاریک جزیرہ'، 'ایک پُرانا شہر'، 'ماضی' اور متعدد نظمیں اسی قبیل کی ہیں۔ یہ کچھ اچھی بات نہیں کہ ہر موضوع کی تہ میں ایک ہی احساس کروٹیں لیتا ہوا محسوس ہو۔ اس سے سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ اگر چہ شاعری میں احساس کا تنوع زیادہ ہوتا ہے لیکن فکر کی رنگا رنگی محدود ہو جاتی ہے۔ کیا اچھا ہو کہ وہ اس طرف بہ طور خاص توجہ کریں۔ شاعری جس وسعتِ فکر و وسعتِ بیان کی طلب گار ہے اور زندگی کی ترجمانی جس پنہائی اور بے کرانی کی متقاضی ہے اور جس کے بغیر اعلا شاعری وجود میں نہیں آتی، یہ انداز اس کے منافی ہے۔

مخمور کے تازہ مجموعۂ کلام 'سیہ بر سفید' کی اکثر نظموں میں یہ لہر جاری و ساری ہے لیکن ان کی حالیہ نظم 'دائروں کے قیدی' اس بات کی اشارہ نما ہے کہ انھوں نے اب خود اس بات کو محسوس کرنا شروع کر دیا ہے اور یہ نظم اس کی دلیل ہے۔ اس نظم میں شاعر کا ذہن ساری حد بندیوں اور پچھلے تلازمات سے گزر کر اس منزل پر پہنچ گیا ہے جہاں فکر و خیال کی بے کرانی جلوہ گر ہوتی ہے۔ اس نظم کو ان کی شاعری میں ایک ایسے سنگِ میل کی حیثیت حاصل ہے جہاں سے ان کی فکر ونظر کی شاہ راہ بدلتی ہے۔ اور یہ بہت نیک فال ہے۔ نظم کا اقتباس آپ بھی ملاحظہ فرمایئے:

نئے نئے دائرے بناتے رہے ہیں ہم تم
کہ مدتوں سے
یہ دائروں کا طلسم، تشکیلِ کائناتِ بشر کی پہچان بن چکا ہے
ہمارا ایمان بن چکا ہے
یہ دائرے زندگی کو تقسیم کر کے، اب آدمی کو تقسیم کر رہے ہیں
اور ان جداگانہ دائروں میں بھی اور کتنے ہی دائرے ہیں
انھی طلسماتی دائروں میں بٹی ہوئی ہوتی ہے ہماری ہستی
نگاہ اس دائرے کی محبوس ہے، دل اس دائرے کا قیدی
عجیب جاں کاہ، پیچ در پیچ سلسلہ ہے
نہ مجھ میں ہمت رہی ہے اتنی، نہ تم میں یہ حوصلہ رہا ہے
کہ اس طلسم سے دو گھڑی کو باہر نکل کے دیکھیں

زمین کتنی وسیع کتنی بڑی ہے اب تک
کبھی کبھی خود ہمارے اندر سے ایک آوارہ لہر اٹھتی ہے
...اور ہم سے یہ پوچھتی ہے
یہ دائروں کا طلسم کیا ہے؟ نظر کا دھوکا ہے، واہمہ ہے
مگر نہ مجھ میں رہی ہے ہمت، نہ تم میں یہ حوصلہ رہا ہے
کہ اس مدو جزر طلسم سے دو گھڑی کو باہر نکل کے دیکھیں
کھلی فضا میں، ہوا کے جھونکوں کے ساتھ کچھ دور چل کے دیکھیں

نظم میں بے بسی کا جو آہنگ آخر آخر میں چھلک اٹھا ہے، وہ ایک حقیقت ہے، تلخ حقیقت جو ہر طرف نظر آتی ہے، انفرادی سطح پر بھی، قومی سطح پر بھی اور طبقاتی سطح پر بھی اور یہ حقیقت، طنز کی جس لطافت کے ساتھ رونما ہوئی ہے، اس نے نظم میں انفعالیت کا انداز ابھارنے کی بجائے تعریض کا رنگ غالب رکھا ہے۔ اور یہ قابل لحاظ خوبی ہے۔

مخمور کی شاعری کا ایک روشن پہلو، اس کا متوازن طرز اظہار ہے، مکتبی تعلیم کے فیض سے لفظوں کی قدر و قیمت کا صحیح احساس پیدا ہوا۔ حسن ادا کا بھی عرفان ہوا اور آج کے بدلتے ہوئے اسالیب بیان کا بھی۔ ذہن قائل دونوں کا ہے، اسیر کسی کا بھی نہیں۔ نہ ہی کسی تعصب کا شکار ہے، اس لیے، انداز بیان میں ایہام کا گذر نہیں، جس کو آج جدیدیت کا سرمایۂ کمال سمجھا جاتا ہے اور جس کا سہارا لے کر ہر ناگفتنی کو گفتنی فرض کر لیا جاتا ہے اور ہر نقص کو کمال مان لیا جاتا ہے۔ نیا پن ہے لیکن بیگانگی سے معرا اور جدت ہے لیکن ذہنی کج خرامی سے محفوظ۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ خیالات واضح ہیں، اقدار پر ایمان ہے۔ مفروضات سے بے تعلقی ہے، خواہ وہ فرد کی تنہائی کا مفروضہ ہو یا فرد کی لاتعلقی کا اور ذہن منفی رجحانات کا گہوارہ نہیں۔ ناکافی، بے اطمینانی، برائی بدحالی سب کا غم ہے، سب کا اظہار بھی ہے لیکن شاعر کا منصب بھی پیش نظر ہے۔ قدیم و جدید کا یہ خوش گوار توازن، مخمور کی شاعری کی جان اور حسن و تاثیر کا سرمایہ ہے۔

مخمور کے یہاں پابند نظموں کے ساتھ ساتھ، نظم معرا کے بڑے کامیاب مرقعے ملتے ہیں۔ آہنگ پر ان کی نظر رہتی ہے لیکن کہیں کہیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ کوشش کر کے بہر صورت نظم معرا کا فارم اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ غالباً اس کاوش کی تہہ میں یہ احساس کارفرما رہتا ہے کہ پرانے پن کی چھاپ نہ لگنے پائے۔ اس سے کہیں کہیں شعریت پر بھی حرف آ جاتا ہے اور کہیں یہ احساس ہوتا ہے کہ ضرورت سے زیادہ معرا پن نمایاں ہو گیا ہے۔ ہئیت کا انتخاب، موضوع اور آسان اظہار کے تقاضے کے تحت ہونا چاہیے۔

60 کے بعد غزل گوئی میں جدت پسندی کی جو رو چلی ہے، اس نے بڑے بڑے کرشمے دکھائے ہیں۔ خیال اور حسن بیان کے بجائے محض لب و لہجے کے اجنبی پن اور مسلمہ تلازموں سے بے نیاز الفاظ کی مدد سے نیا پن چمکانے کی کوشش کی گئی۔ اس کے عجیب عجیب مضحک نمونے سامنے آتے رہتے ہیں جن کو دیکھ کر عبرت حاصل کرنے کو جی چاہتا ہے۔ مخمور کی غزلیں عموماً نہایت رچے ہوئے ذوق اور نہایت تربیت یافتہ ذہن کے انداز بیان کا نتیجہ ہیں۔ ان میں جدت خیالات قدرت اظہار کا مظہر ہے، لفظوں کے بے ڈھنگے انتخاب کا نہیں۔

لیکن بعض لمحوں میں مخمور کا ایمان کمزور ہو گیا ہے اور روش عام کی چھوٹ پڑ گئی ہے۔ تلخ وتند الفاظ اور شعریت سے محروم طرز ادا کو نئے پن کی ضمانت انھوں نے سمجھ لیا ہے۔ مثلاً

میں نے چاہا تھا کہ پر کاٹ دوں جن لمحوں کے
اڑ گئے وقت کی مٹھی سے کبوتر کی طرح
پاگل ہوا نے لے کے سمندر کی گود سے
صحرا کی گرم ریت میں دفنا دیا مجھے

یہ شعر اس مخمور کے نہیں معلوم ہوتے جس نے ایسے شعر کہے ہیں:

داستاں گو کے تخیل کی جھلک آنکھوں میں
کھوئی کھوئی سی نظر طبع سخن ور کی طرح
جب کوئی شام حسن نذر خرابات ہوئی
اکثر ایسے میں ترے غم سے ملاقات ہوئی
ہم سے پہلے بھی یہ افسانہ بیاں ہوتا تھا
کتنے غم پھر بھی ہیں تشنۂ اظہار ملے
عمر بھر جادۂ پرخار پہ چلنا ہوگا
دو گھڑی سایۂ گل میں بھی ٹھہرتا جاؤں
کس کڑی دھوپ میں ہم گھر سے نکل آئے ہیں
بیٹھ جائیں جو کہیں سایۂ دیوار ملے
لذیذ ہو تو حکایت دراز ہوتی ہے
ہم اہل غم کے فسانے تو مختصر ہوں گے

مخمور کی شاعری اپنے عہد سے زیادہ، شاعر کے احساس اور اس کے ماضی و حال کی آئینہ دار ہے۔ یہ اس کے ذہنی سفر کی داستان ہے، اس کی محرومیوں کی کہانی ہے اور اس کے عقیدوں کی ترجمان بھی۔ اس ترجمانی میں اسی طرح کی وقعت پنہاں ہے جو شاعری کی علامتوں میں پنہاں ہوتی ہے۔ ہم اس کی شاعری میں اس کے ماضی و حال کو دیکھ سکتے ہیں جو بدلتے ہوئے حالات کے داستاں سرا ہیں۔ اس میں شخص کا افسانہ زیادہ ہے اور دنیا کا افسانہ اس کے ذیل میں بیان ہوا ہے۔ یہ خیالات کی داستان کم ہے، تاثرات کی کہانی زیادہ ہے اور اسی نے اس میں سچائی، سادگی اور تاثیر کا جادو جگایا ہے۔ اس میں عشق کے قصے ہیں لیکن ان کا انجام بھی ناکامی ہے۔ اس میں اپنی کہانی ہے اور اس میں بھی محرومی کا حصہ زیادہ ہے، اس میں دنیا کا افسانہ ہے، لیکن اس میں بھی بے اطمینانی کا عنصر غالب

ہے۔ یہ ناتمامیاں بہت کافی تھیں ۔ اس بات کے لیے کہ ذہن آلودہ ہو کر رہ جائے ، برہنہ گفتاری شعار بن جائے ، اور غیظ و غضب کی آگ میں الفاظ اور خیالات ، جل اٹھیں لیکن شاعر کے متوازن ذہن نے یہ صورتِ حال نہیں پیدا ہونے دی، اور یہ بڑی بات ہے، اور یہی مخمور کی شاعری کا بڑا جوہر ہے، لیکن ابھی وہ دائروں کے طلسم میں کسی نہ کسی حد تک قید ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ وہ ان سے بالکل باہر نکل آئیں اور ان کے یہاں شخص کا اثر کچھ اور کم ہو کر، کائنات کا اثر بڑھ جائے۔ اور یہ اثر کسی زیریں لہر کا اسیر نہ ہو۔ ریاستوں میں شخص کی اہمت سب ۸ سے زیادہ ہوتی ہے۔ وہی سب کچھ ہوتا ہے، اس لیے اگر ان کے یہاں اس کے اثرات ملتے ہیں، تو کچھ زیادہ تعجب کی بات نہیں لیکن ان کے یہاں جس تنوع کی تہہ داری ہے، اور جس کا اظہار بھی اب زیادہ وضاحت کے ساتھ ہو چلا ہے اس کے پیشِ نظر اس کی یہ جا طور پر توقع کی جا سکتی ہے کہ جلد ہی ان کی شاعری کی فضا اس تجدید سے خالی نظر آئے گی۔

(بشکریہ ماہ نامہ ''شاہ کار''، الہ آباد)

□□□

ہندوستان کا صنعتی ارتقا

مصنف: ڈاکٹر ڈی. آر. گیڈگل، پروفیسر ایم. صدیقی

ہندوستان کی تاریخ میں 1857 ایک اہم سنگِ میل ہے۔ اس سال نہ صرف ملک پر پوری طرح سے انگریز قابض ہوگئے بلکہ اسی کے بعد ہندوستانیوں کی خود احتسابی کا دور بھی شروع ہوا جس کے نتیجے میں مختلف اصلاحی تحریکات وجود میں آئیں اور ملک نشاۃ الثانیہ سے ہم کنار ہوا۔ 1857 کے بعد سے وہی صحیح معنوں میں ہندوستان کی صنعتی ترقی بھی شروع ہوئی۔ اس کتاب میں 1860 سے 1939 تک ملک کے صنعتی ارتقا کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔

صفحات: 343، قیمت-/130 روپے

صنعتی تنظیم اور انتظام

مصنف: محمد احترام اللہ

آج کے صارفی سماج میں انتظامی شعبے کی اہمیت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ ایک کامیاب منتظم حال پر نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ مستقبل کے لیے منصوبہ بندی بھی کرتا رہتا ہے۔ یہ کتاب نہ صرف بی. کام کے طالب علموں کی ضرورت کو پوری کرتی ہے بلکہ علم دوست اردو قاری کو بھی جدید صنعتی شعبے اور معیشت کے دیگر رموز سے آگاہ کرتی ہے۔

صفحات: 606، قیمت-/149 روپے

انقلاب 1857

مرتب: پی. سی. جوشی

انقلاب 1857 ہندوستانی تاریخ کا ایک ایسا غیر معمولی واقعہ ہے جس کے ملک اور قوم پر دور رس اثرات مرتسم ہوئے۔ انگریزوں کی غلامی سے نجات پانے کے لیے یہ پہلی قومی بغاوت تھی جس نے ملکی سطح پر یکجہتی کے جذبات کو ابھارا۔ اس کتاب میں مختلف شعبہ ہائے حیات پر، اس کے اثرات کا ہندوستانی مورخین اور ادیبوں کے علاوہ غیر ملکی قلم کاروں نے بھی جائزہ لیا ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا بین الاقوامی سطح پر بھی غیر معمولی نوٹس لیا گیا۔

صفحات: 386، قیمت-/215 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دهلی کی جانب سے طلبه اور اساتذه کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی هے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب هے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

شین کاف نظام

بھیڑ میں اکیلا

مخمور سعیدی کے پہلے شعری مجموعے ''گفتنی'' (مطبوعہ 1960) کے تعارف میں گوپال متّل مرحوم نے لکھا تھا:

''مخمور کے کلام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اس کے مخصوص زاویۂ نگاہ اور اس کے اپنے واردات قلبی کا آئینہ دار ہے۔ اس نے شعری مفروضوں کو قلم بند کردینے پر قناعت نہیں کی بلکہ جو احساس اور خیالات اس کے دل و دماغ میں ابھرتے رہے ہیں انھیں کی عکاسی کو اس نے اپنا فرض سمجھا ہے۔ لہٰذا اس کے کلام میں ندرتِ فکر بھی ہے اور ندرتِ احساس بھی...... مخمور کے کلام میں آپ اُس پندار بیجا کا مظاہرہ بھی نہیں پائیں گے جو اپنے منطقی مفہوم میں احساسِ بے مائگی کی تلافی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ اس کے نزدیک خودداری کے معنی یہ نہیں کہ انسان کا کوئی مرکزِ عقیدت ہی نہ ہو۔ اس کا سر جھکتا ہے لیکن چوکھٹ دیکھ کر۔''

آگے بڑھنے سے پیشتر متّل مرحوم ہی کا ایک اور اقتباس دیکھ لیں۔ مخمور کا تعارف کراتے ہوئے اپنے مؤقر رسالہ ''تحریک'' کے اکتوبر 1953 کے شمارے میں انھوں نے لکھا تھا:

''نوجوان شاعروں میں بہت کم شاعر بے عیب شعر کہتے ہیں اور ان چند شاعروں میں مخمور سعیدی شامل ہیں۔''

جس زمانے میں یہ باتیں کہی گئیں وہ زمانہ اردو کے اُجڑنے کا زمانہ ہے۔ تقسیم کے رِستے زخم میں سیاسی اور سماجی زندگی غیر یقینی کی سرد سرنگ سے گزر رہی ہے، ایسے عالم میں آداب و اطوار کسے یاد رہتے ہیں لیکن حق تو یہ ہے کہ اقدار و آداب کا معاشرہ میں استحکام کتنا ہے اس کا پتہ تو ایسے حالات ہی میں چلتا ہے۔ جب ادبی منظرنامہ میں ترقی پسند تحریک، اپنے تحفظات و تعصبات کے سبب اپنا وزن و وقار کھو رہی تھی اور جدید رجحان اپنے پیروں پر کھڑا ہو رہا تھا۔ جدید رجحان اس تحریک کو رد کرتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا لیکن دونوں مخالفین میں ایک قدر مشترک ہے اور وہ ہے مروّج شعری محاورے سے انحراف۔ کلاسیکل شعریات سے انحراف اس کی زبان اور بیان کی تضحیک۔ ہر تحریک اور رجحان تردید کے عمل ہی سے وجود میں آتا ہے، لیکن ان دونوں میں باہمی قدغن کے ساتھ ساتھ قدامت سے اَن بن مشترک ہے۔ چنانچہ دونوں اپنی اپنی طرح اور طریقے سے مروّج شعری محاورے سے منحرف ہو رہے تھے۔ دونوں کو ''کیسے کہا ہے'' سے بیزاری ہے۔ یعنی زور ''کیا کہا'' پر ہے اس شدت اور انتہا پسندی کے دور میں متّل صاحب کا یہ قول مخمور سعیدی کے لیے بہت بڑا Compliment ہے۔

سچا اور اچھا مترادف الفاظ نہیں ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ہر اچھا شاعر سچا ہو یہ ضروری نہیں اور ہر سچا شاعر اچھا ہو یہ بھی ضروری نہیں۔ اچھائی اور سچائی میں ایک کسبی قابلیت ہے تو دوسری ذہنی صلاحیت ہے۔ دونوں کا ایک جگہ جمع ہونا ناممکن نہیں تو بھی مشکل ضرور ہے۔ مخمور کے کلام میں یہ دونوں خوبیاں موجود ہیں تو اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ شخصیت کی شناخت پانے کے لیے جس طرح سرگرداں ہیں شخصیت سے گریز کرنے میں بھی اتنے ہی مستعد ہیں۔ غالباً یہی سبب ہے کہ ان کی شاعری موضوعی بھی ہے اور معروضی بھی۔ لیکن کسی شاعری کا موضوعی اور معروضی ہونا اس بات کی دلیل نہیں کہ وہ ترقی پسندی اور جدیدیت کا مرکّب ہے یا ان کے نقطۂ اتصال پر کھڑی ہے۔ اچھی اور سچی شاعری کا راستہ خانوں میں منقسم ہونے کی طرف نہیں جاتا۔ وہ تو تفریق و تقسیم مٹانے کی طرفیں کھولتی ہے۔ جو ہر شدت و انتہا پسندی کے اعلان اور ادّعا کی تخلیقی نفی کرتی ہے۔ تخلیقی تحریف ہی تو اس کے ارتقا کی دستاویز ہوتی ہے۔

مخمور کی تعلیم و تربیت کلاسک پسند معاشرے کے مذاق و معیار و مزاج کے مطابق ہوئی۔ یہ وہ معاشرہ ہے جس کے پاس غنائیت اور شجاعت کی شاندار روایت ہے۔ عجمی شعریات کے ساتھ محمود شیرانی کا علم بھی ہے اور ان کے لاڈلے بیٹے اختر شیرانی کی وہ شاعری بھی ہے جو ایک طرف علامہ اقبال کے شعری سحر کے خلاف تخلیقی احتجاج کا حکم رکھتی ہے تو دوسری طرف ترقی پسند اور حلقۂ اربابِ ذوق دونوں شعرا کی تادیب و تربیت بھی کرتی ہے۔ غزل کی شعریات میں پروان چڑھے مخمور کے لیے روایتی غزل ہی کا ہو رہنا بہت آسان تھا لیکن انھوں نے تو کلاسک کے اس شعبے سے مصافحہ و معانقہ کیا تھا جس کا ایک نام ارتقا ہے۔ یہ ارتقا روایت کی تفہیم کے بغیر ناممکن ہے۔ روایت کا مطلب جامد ہونا نہیں ہے۔ روایت تو سیّال شے ہے۔ تبدل جس کا وصفِ خاص ہے۔ تو حافظہ کے احترام کے ساتھ نئے تخلیقی تقاضوں کو تسلیم کرنا جس کی

● معروف شاعر و ادیب جناب شین کاف نظام مرحوم مخمور سعیدی کے ہم وطن ہونے کے ساتھ ساتھ قریب ترین دوستوں میں ہیں۔ انھوں نے یہ مضمون تقریباً 10سال قبل لکھا تھا جو ان کی مرتب کی ہوئی کتاب ''بھیڑ میں اکیلا'' میں شامل ہے۔ مخمور سعیدی کے فن اور ان کی شخصیت پر لکھے گئے مضامین پر مشتمل یہ کتاب 2001 میں شائع ہوئی تھی۔ (ادارہ)

شناخت ہے۔ مخمور کا شعری سفر شاہد ہے کہ انھوں نے انھیں خطوط پر سفر کیا ہے۔ ان کی زبان اور ان کے بیان میں رفتہ رفتہ جو تبدیلیاں آئی ہیں اگر ان کا تاریخی تناظر میں مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ ''گفتنی'' کا شاعر ''بانس کے جنگلوں سے گزرتی ہوا'' تک پہنچتے پہنچتے اظہار و اسلوب کے معاملے میں بالکل دوسرا شاعر ہوگیا ہے۔ اپنی بات کی تائید و تصدیق کے لیے مخمور کی مندرجۂ ذیل دو نظمیں ملاحظہ ہوں۔ پہلے ''گفتنی'' کی پہلی ہی نظم ''تعارف'' کے یہ چند شعر دیکھیے:

میں کہ دلدادۂ لیلائے شبِ تار بھی ہوں
شاہدِ صبح کے جلوؤں کا پرستار بھی ہوں
خود کسی کاکلِ پرخم کا گرفتار بھی ہوں
ضربِ کاری یہ نظامِ رسن و دار بھی ہوں
مکتبِ فکر میں ہوں داعیِ صد ہوش و خرد
محفلِ شوق میں بہکا ہوا میخوار بھی ہوں
مجھ کو ہے مسلکِ یارانِ طریقت بھی عزیز
اور وارفتۂ ترکانِ سیہ کار بھی ہوں

یہ نظم سات اشعار کی ہے۔ میں نے نمونے کے لیے صرف چند شعر یہاں پیش کیے ہیں۔ اب ان کی دوسری نظم ملاحظہ ہو۔ یہ نظم ان کے مجموعے ''بانس کے جنگلوں سے گزرتی ہوا'' کی پشت پر بغیر کسی عنوان کے شائع ہوئی ہے لیکن اسے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا عنوان بھی ''تعارف'' ہی رہا ہوگا:

میرا نام سلطان محمد خاں ہے
میں بیٹا ہوں
مولانا احمد خاں کا
جو پنج وقتہ نمازی تھے
لیکن میں فجر کی نماز کے وقت
سویا ہوا پایا جاتا ہوں
ظہر اور عصر کی نمازوں میں
دفتری مصروفیت—
میرا پیچھا نہیں چھوڑتی
مغرب اور عشا کی نمازیں
مجھ پر لعنت بھیجتی ہیں
کہ یہ وقت میری شراب نوشی کا ہے
اس کے باوجود مجھے
اپنے نام پر بھی اصرار ہے
اور اپنی ولدیت پر بھی

''بانس کے جنگلوں سے گزرتی ہوا'' 1983 میں شائع ہوا۔ ''گفتنی'' 1960 میں۔ دونوں کے درمیان تیئیس برس کا بُعد ہے۔ اس بیچ اظہار میں ان کے یہاں جو غیر معمولی تبدیلی آئی ہے وہ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اب ''دلدادۂ لیلائے شبِ تار'' اپنا تعارف صفت میں نہیں اسم میں کراتا ہے۔ اور وہ بھی بالکل سیدھی سادی نثر میں ''میرا نام سلطان محمد خاں ہے۔'' ''وارفتۂ ترکانِ سیہ کار'' پر فخر و مباہات کرنے والا کہتا ہے میں بیٹا ہوں/ مولانا احمد خاں کا۔ وارفتگی کی جگہ رشتوں اور ان سے پیدا ہوسکنے والی ذمے داری نے لے لی ہے۔ اسلاف کی شخصیت کی عظمت کا احساس اور اظہار صرف ایک لفظ ''مولانا'' سے ہوا ہے۔ والد کی دینوی حیثیت ہی ان کی دنیاوی حیثیت کا پتہ دیتی ہے۔ کیونکہ ''وہ پنج وقتہ نمازی تھے''۔ پنج وقتہ نمازی اپنے مذہبی فرائض کی ادائیگی تو کر ہی رہا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ معاشرہ اس کی مؤعظمت کا بھی قائل ہوجاتا ہے جو عزت و احترام اور سماجی وقار کی ضمانت بھی ہے۔ دنیا اور عقبیٰ دونوں کو خیال میں رکھتے ہوئے اقدار اساس زندگی بسر کرنے والے اسلاف کا وہ بیٹا جو، فجر کی نماز کے وقت یہ جانتے ہوئے اقدار اساس زندگی بسر کرنے والے اسلاف کا وہ بیٹا جو، فجر کی نماز کے وقت یہ جانتے ہوئے بھی کہ نماز فرض ہے، اس سے بہتری اور برتری حاصل ہوتی ہے اور یہ مانتے ہوئے بھی کہ نیک اسلاف کے افعال ان کی مغفرت اور ان کے اطفال کی بہبودی کے ضامن ہیں، سویا رہتا ہے۔ ظہر اور عصر کی نمازیں دفتری مصروفیت کی نذر ہوجاتی ہیں تو مغرب اور عشا کی نمازیں اس کی شراب نوشی کی بھینٹ چڑھ جاتی ہیں۔ وہ ودیعت ہوئے فرائض میں سے ایک بھی فرض پورا نہیں کر پا رہا ہے۔ مشینی اور معدنی معاشرت اسے اتنی مہلت ہی کہاں دیتی ہے کہ وہ اپنے پیٹ کا پاپ دھونے کے ساتھ ساتھ اپنی عاقبت بھی سنوار سکے۔ یہ ندامت کا احساس، یہ گناہ کا اعتراف، یہ اسلاف کی عظمت کے اظہار کے ساتھ اپنی مجبوری اور نام نہاد بداعمالی، نام نہاد اس لیے کہ یہ سب بڑے شہروں کا معمول ہے، اس کے کلچر کا حصہ اور وہاں کی معاشرت میں فٹ ہونے کا ہنر اور شکم سیری کا وسیلہ بھی۔ اس کے باوجود راوی کو اپنے نام اور اپنی ولدیت پر اصرار ہے۔ فخر ہے۔ اپنے ماضی پر۔ جسم حال میں اور ذہن ماضی میں۔ جدید تہذیب اور اس کے معاشرے کا یہی تو المیہ ہے۔ یہاں مشرق و مغرب کی جدیدیت میں جو قابلِ غور تفریق ہے اس کا ذکر بھی بے موقع نہیں ہوگا۔ مغرب میں Belonging کی تلاش ہے۔ اپنی روایت کی تلاش اور اس کے نہ ملنے پر اس کی تشکیل و تعمیر اور اس کے بعد ممکنہ حد تک کوشش کر کے اس مستحکم کرنے کی سعی مسعود اور یہ خواہش کہ اہلِ دنیا ہمیں بھی کسی روایت کی روشنی میں پہچانیں۔ مثال کے لیے آنیل Eugene O'Neill کا ڈراما The Hairy Ape ملاحظہ ہو، اور بھی کئی افسانے اور

ڈرائے ہیں۔ جب کہ مشرق میں مستحکم روایتوں کے منہدم ہونے کا ملال ہے، جھنجھلاہٹ ہے۔ یہ فرق دونوں کے رویّوں اور رسائی کا فرق ہے۔ ژولیدہ بیانی سے دونوں کے یہاں گریز ہے لیکن سادگی میں پُرکاری مشرقی شاعری کی شناخت ہے۔ دوسری نظم کی بافت دیکھیں۔ آٹھویں مصرع کے علاوہ کہیں اوقاف کا استعمال نہیں ہے۔ اس سے یہ مطلب بھی اخذ کیا جاسکتا ہے کہ شاعر زندگی میں در آئی یکسانیت کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ ''دفتری مصروفیت'' کے بعد ڈیش (Dash) ایک تذبذب کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔ نظم کو پڑھتے ہوئے لگتا ہے کہ اس کا کلیدی مفہوم یکسانیت ہے۔ یکسانت ہی بے معنویت کو جنم دیتی ہے، لیکن اس بے معنویت میں بھی مخفی معنویت ہے جو جینے کی تحریک و ترغیب دیتی ہے۔ مصرعوں کی صفائی بذاتِ خود یکسانیت کی مظہر ہے۔ ورنہ چوتھا مصرع روش سے ہٹ کر بھی تحریر کیا جاسکتا تھا

مثلاً:

میں بیٹا ہوں
مولانا احمد خاں کا
جو پنج وقتہ نمازی تھے

لیکن یہ مصرع روش سے ہٹ کر نہیں لکھا گیا ہے اور اس کے بعد کا مصرع بھی لیکن سے شروع ہوتا ہے حرفِ ربط سے شروع ہونے والا یہ مصرع نقطۂ گریز بھی ہے۔ اب دفتری مصروفیت والے مصرع پر غور فرمایئے تو محسوس ہوگا کہ یہیں سے دینی راستہ دنیوی موڑ لیتا ہے۔ ڈیش اس لیے بھی ضروری ہے۔ اجمالاً یہ کہا جاسکتا ہے کہ تیئیس برسوں میں آئی یہ تبدیلی مخمور کے تخلیقی تجسس کا نتیجہ ہے۔

مخمور سعیدی کا خاندان صاحبِ سیف بھی تھا اور صاحبِ قلم بھی۔ صاحبِ سیف دوسروں سے لڑتا ہے اور صاحبِ قلم خود سے۔ ییٹس (Yeats) نے شاید اسی لیے کہا تھا کہ: Poetry is the Result of a Quarrel with Ourselves مندرجہ بالا نظموں میں، پہلی نظم میں مخمور صاحبِ سیف پہلے نظر آتے ہیں، صاحبِ قلم بعد میں۔ پٹھانیت کا زبان پر، آہنگ پر اور الفاظ کے انتخاب پر غلبہ نظر آتا ہے۔ اس لہجے کے سب سے بڑے شاعر جوش ملیح آبادی ہیں۔ پھر ردیف میں آیا حرفِ شرکت ''بھی'' راوی کے کچھ اور اوصاف کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے۔ یہ وہ اوصاف ہیں جن کا بیان یا ذکر نظم مذکور میں نہیں ہے۔ یعنی باقی کے اوصاف کے متعلق خود قاری سوچے اور اندازہ لگائے۔ دوسری نظم میں سیدھی سادی زبان ہے۔ تکلف، تصنع اور بلند آہنگی کی جگہ سپاٹ بیانی سادگی اور دھیما لہجہ ہے۔ نہ حرفِ شرکت کی تکرار نہ وزن و بحر کی پابندی۔ ہاں حرفِ شرکت ''بھی''، نظم کے آخری دونوں مصارع میں آیا ہے۔ اسی شدت اور قطعیت کے ساتھ لیکن تفرق دونوں میں نمایاں ہے۔ مفرس و معرّب الفاظ کی بجائے عصری اردو کے الفاظ آئے ہیں۔ یعنی صاحبِ سیف کی رعونت صاحبِ قلم کی محبت میں ڈھل گئی ہے۔ یہ عمل ہمیں مرزا غالب کی بھی یاد دلاتا ہے۔ غالب بھی صاحبِ سیف اسلاف کے اخلاف میں سے تھے۔ وہ بھی مشکل سے آسان زبان کی طرف آئے۔ جس کی بہترین مثال داغ دہلوی ہیں۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری جان پڑتی ہے کہ آسان زبان کا مطلب اکہری شعری زبان نہیں ہوتا۔ بیان کی سادگی معنی و مضمون کی سادگی نہیں ہوتی۔ کبیر اور میر کی شاعری اس کی بہترین مثال ہے۔

اس تبدیلی کے پس پشت کیا ہے۔ یعنی یہ تبدیلی مخمور کے یہاں کیوں کر آئی؟ اور اس سے بھی بڑا سوال یہ ہے کہ ان کے معاصر شعرا میں جب یہ تبدیلی اتنی تیزی سے آئی تو مخمور کے یہاں یہ تبدیلی اتنی دھیرے، اتنی سست رفتار سے کیسے ہوئی کہ ادب میں قریب قریب دو نسلیں ختم ہو گئیں۔ مجھے لگتا ہے کہ اس کا سبب ان کی شخصیت میں رچا بسا صبر و تحمل ہے۔ وہ کبھی ہڑبڑاہٹ میں نہیں ہوتے۔ ہمارے ممتاز شاعر بلراج کومل سے جب کسی نے پوچھا کہ آپ اتنے سست گام کیوں ہیں تو انھوں نے کہا کہ مجھے کہیں پہنچنا نہیں ہے۔ مجھے یہی بات مخمور صاحب کے معاملے میں معلوم ہوتی ہے۔ وہ اتنے اعتماد اور سکون سے چلتے ہیں گویا ان کا ہر قدم منزل پر ہی ہے۔ یہ معاملہ فہم فرد کی سست گامی نہیں جو ہر قدم پھونک پھونک کر رکھتا ہے۔ یہ ایک ایسے فرد کی سست گامی ہے جسے اپنے عمل پر اعتماد ہے۔ مخمور نے روایت سے اپنے تخلیقی سروکار کے متعلق'' واحد متکلم'' میں لکھا ہے:

''میں یہ سمجھتا ہوں کہ شاعر کے لیے اپنی شعری روایت سے مکمل انقطاع ممکن نہیں۔ شعری او راوبی روایت صدیوں کے تہذیبی تسلسل کا حصہ ہوا کرتی ہے۔ سفر کے کسی موڑ پر یہ تسلسل ٹوٹ سکتا ہے لیکن اُس کے آثار باقی رہتے ہیں اور پھر ایک نئے فکری عمل کا سرچشمہ بنتے ہیں...

شاعر کی تخلیقی انفرادیت ہی اس کی پہچان ہوا کرتی ہے لیکن اس انفرادیت کی تشکیل میں اس کی وہ فنی بصیرت بھی کارفرما رہتی ہے جو اسے اپنے پیش روؤں سے ملتی ہے۔''

اور آخر میں لکھتے ہیں:

''میری شاعری میری ذہنی اور جذباتی سوانح عمری ہے، میری آپ بیتی، اس میں جگ بیتی بھی آگئی ہے تو اس لیے کہ میں ایک سماج میں زندہ ہوں اور یہ سماج خود بھی مجھ میں جی رہا ہے۔''

شعری روایت سے یہ تعلق اور سماج سے ایسا رشتہ کہ ایک کے بغیر دوسرے کا وجود مشتبہ وہ مشکوک ہے انھیں اپنے معاصر شعرا سے مختلف کرتا ہے۔

ان کا شعری رویہ تو عرفی کے اس شعر کے مصداق ہے

عارف ہم از اسلام خراب ست ہم از کفر
پروانہ چراغ حرم و دیر نہ داند

رشتوں کی یہ روایت، احترام و اعتراف میں زیریں انحراف اور فنی اعتکاف ہی انھیں بھیڑ میں اکیلا بناتا ہے۔

مخمور بنیادی طور پر سچے شاعر ہیں۔ اس لیے جس طرح انھیں ادبی خانہ بندی میں نہیں ڈالا جاسکتا ویسے ہی انھیں کسی ایک صنف کا شاعر بھی نہیں مانا جاسکتا۔ انھوں نے دنیا اور اس کے معاملات کو اپنی نظر سے دیکھا ہے اور اپنے مشاہدہ کو بادہ وساغر کہے بغیر بیان کردیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اُن کی شاعری سامعی اور بصری دونوں اوصاف سے مالامال ہے۔ وہ ہزاروں کے مجمع میں بھی دل کو چھوتی ہے اور تخلیے میں بھی قاری کو متاثر کرتی ہے۔ ان کی شاعری کوئی سمجھوتا نہیں کرتی۔ وہ اس کی پروا بھی نہیں کرتے کہ معاصر فن کے فیشن کا رُخ کدھر ہے، اور آج کا نقاد کیا پسند کرتا ہے۔ وہ مصلحت اور مفاد کے زیرِ اثر کوئی بیان نہیں دیتے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

''مجھے اس اعتراف میں کوئی تامل نہیں کہ میرے ذہن وذوق کی ابتدائی تربیت کلاسکیت اور نوکلاسکیت کے زیرِ اثر ہوئی ہے۔ مجھے یہ بھی اعلان کرنا چاہیے کہ ادب کے سکّہ بند ترقی پسند نظریے سے مجھے اختلاف ہے لیکن ترقی پسند شاعروں نے جو اچھی شاعری کی ہے، میں اسے اپنے حافظے سے نہیں جھٹک سکتا۔

جدیدیت میرے لیے تخلیقی سچائی کا دوسرا نام ہے، ہر دور میں ہر سچا تخلیقی فن کار ''جدید'' ہوگا اور رسمی شعرگوئی کی ذلّت میں خود کو مبتلا نہیں کرے گا۔''

جدیدیت کو تخلیقی سچائی کے دوسرے نام سے تعبیر کرنے والے مخمور سعیدی اور ادب کے سکّہ بند ترقی پسند نظریے سے اختلاف رکھنے والے مخمور سعیدی جب ''جدیدیت'' میں بھی جامد کرنے والے عناصر کی کارفرمائی دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں:

''پھر ایک نئی قسم کے نظریے طراز سامنے آئے اور انھوں نے جدیدیت کو اس کے ماحولی پس منظر کا اتنا تابع بنانا چاہا کہ ''جدیدیت'' بھی ایک فارمولا بننے لگی ـــ دبی دبی زبان سے ''نئی'' جدید موضوعات'' بھی گنائے جانے لگے اور ''جدید ٹکسالی زبان'' کی نشاندہی بھی کی جانے لگی۔ ان کوششوں سے، خواہ ان کے پیچھے جدید شاعری کی تفسیر وترویج کا کیسا ہی مخلصانہ جذبہ کارفرما کیوں نہ ہو، جدید شاعری کا اُفق سکڑا ہے اور تخلیقی اظہار کے آزادانہ عمل کو ضعف پہنچا ہے۔''

''فاروقی (شمس الرحمٰن فاروقی) نے جدیدیت کو بھی کلیشے بنادیا۔ انھوں نے موضوعات طے کرنے اور زبان مقرر کرنے کی کوشش کی۔ میں اس بات کو تسلیم نہیں کرتا۔''

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ فاروقی کی تمام صلاحیتوں ہی سے منحرف ہوگئے ہیں وہ ان کی تنقید کو پسند کرتے ہیں، چنانچہ دوسرے سوال کے جواب میں کہتے ہیں:

''فاروقی کی تنقید اس لیے اچھی ہے کہ وہ شاعر بھی اچھے ہیں۔''

ان بیانات سے جہاں ان کے مزاج کے توازن اور اعتدال کا پتہ لگتا ہے وہاں اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ اس خیال سے متفق ہیں کہ نقاد کے لیے شاعر ہونا ضروری ہے اور اچھا شاعر ہی اچھا نقاد ہوسکتا ہے۔ خیر، یہ تو جملۂ معترضہ تھا۔ بات مخمور کے اُس شعری مزاج کی تھی جو سمجھوتا نہیں کرتا اور جو ہر انتہا پسندی کے خلاف آواز بلند کرتا ہے۔ وٹجنسٹائن Wittgenstein نے فلسفی کی تعریف یوں کی ہے:

The Philosopher is not a Citizen of any Community of Ideas. That is what makes him a philosopher.

کیا یہی تعریف ایک سچے شاعر کی نہیں ہوسکتی؟ مجھے تو لگتا ہے کہ شاعری بھی ختم نہ ہونے والی تشنگی اور تجسس ہی کا دوسرا نام ہے اور یہ کبھی ختم نہ ہونے والی تشنگی اور تجسس کسی ایک طرح کے آئیڈیا یا آئیڈیالوجی سے کیسے سیر یا ختم ہوسکتا ہے؟ خیر، تو مخمور سعیدی انھیں معنوں میں سچے شاعر ہیں کہ انھوں نے عصریت میں ہمہ عصریت کا دامن نہیں چھوڑا۔ کسی مصلحت کے تحت کسی کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی۔ ہمارے عہد میں یہ بہت بڑی بات ہے۔ انھیں اس کی قیمت بھی چکانی پڑی ہے جس کا ذکر کسی اور مقام پر کروں گا۔

مخمور نے اپنی شاعری کو اپنی ذہنی اور جذباتی سوانح عمری کہا ہے لیکن یہ ذہن تلخ تجربوں سے تشکیل ہوا ہے۔ بہت ممکن ہے اسی لیے وہ ساحر لدھیانوی کو پسند کرتے رہے ہوں لیکن ساحر اور مخمور کے فنی معاملات میں بہت فرق ہے۔ مخمور کے تجربے کی سطح صرف اور صرف شعر ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں

ہم کہ آیاتِ غمِ دل کے امیں ہیں مخمور
جو سبق ہم نے پڑھا ہے وہ کتابوں میں کہاں

احساس کی آنکھ جو دیکھتی ہے وہ بصیرت کی بینائی ہے۔ اور اک کی اَنا اسے سمجھنے کا ادّعا تو کرتی ہے، سمجھتی کہاں ہے۔ پھر ہمارا شاعر ''غمِ دل'' نہیں ''آیاتِ غمِ دل کا امیں'' ہے اسے سمجھنے کے لیے تو Decoding کے عمل میں بھی مہارت چاہیے۔ یہی سبب ہے کہ سوالوں میں تو سچائی ہے لیکن ہر جواب کے آگے استفہامیہ لگا ہوا ہے:

لفظ سہمے ہوئے، لہجے میں یہ لکنت کیسی
جو سوالوں میں صداقت تھی جوابوں میں کہاں

میں نے کہا ہے کہ مخمور اپنے معاصرین سے مختلف ہیں۔ اب ان کا یہ شعر اور اس میں کی گئی تلقین ملاحظہ کیجیے اور اس موضوع پر ان کے معاصرین کے اشعار سے تقابلی مطالعہ کر کے دیکھیے:

پرانے خواب پلکوں سے جھٹک دو، سوچتے کیا ہو
مقدر خشک پتوں کا ہے شاخوں سے جدا رہنا

اور

عجب کیا ہے اگر مخمور تم پر یورش غم ہے
ہواؤں کی تو عادت ہے چراغوں سے خفا رہنا

اُن کی غزل روایت سے رَس حاصل کرتی ہوئی کس طرح انفرادیت کی حامل ہے۔ اس کی تفہیم کے لیے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں:

کہتے تو ہو یوں کہتے یوں کہتے جو وہ آتا
سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا
تم مخاطب بھی ہو قریب بھی ہو
تم کو دیکھیں کہ تم سے بات کریں

فراق گورکھپوری

''وہ مخاطب بھی ہے قریب بھی ہے''
بات سنتا نہیں مگر میری!

مخمور سعیدی

اتنے بیگانۂ آداب ملاقات نہ تھے
کھو گئے ہم تو مگر سامنے پا کر تجھ کو

مخمور سعیدی

لیکن دراصل یہ شعر اس شعر کی تلاش میں لکھے گئے:

تیری باتوں کی طرف دھیان ہمارا نہ گیا
کھوئے کھوئے سے رہے اپنے خیالات میں ہم

مخمور سعیدی

مخمور نے اسی طرح یگانہ چنگیزی کو بھی اپنی شعری روایت کا جز بنایا ہے

مجھے اے ناخدا آخر کسی کو منہ دکھانا ہے
بہانہ کر کے تنہا پار اتر جانا نہیں آتا

یگانہ چنگیزی

ہمیں تو ساتھ دینا ہے رفیقانِ تلاطم کا
مبارک تجھ کو تنہا اس ندی کے پار اُتر جانا

مخمور سعیدی

راقم الحروف اپنے ذاتی تجربے کی بنیاد پر کہہ سکتا ہے کہ مندرجہ بالا شعر کا پہلا مصرع ان کی زندگی کا دستور العمل ہے۔

مخمور ٹونک میں پیدا ہوئے اور دلّی میں رہے۔ عمر عزیز کا بڑا حصّہ دلّی میں گزارنے کے بعد بھی وہ آج تک ذہنی طور پر ٹونک ہی میں آباد ہیں۔ انھیں دیکھ کر لگتا ہے کہ دلّی میں ٹونک آباد ہے۔ بڑے شہروں کی عسکر مزاجی میں گاؤں کی معصومیت موجود ہے۔ وہی صدق دلی، وہی وضع داری اور وہی دوسرے کے درد میں شرکت کی تیاری:

جی نہ پائیں گے زندگی دُہری
ایسا لگتا ہے ہم اکہرے ہیں

لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ اپنے قرب و جوار سے بے خبر ہیں۔ کہتے ہیں:

ہمارے شہر، پھر مخمور مقتل بنتے جاتے ہیں
بدل کر بھیس پھر چنگیز و نادر لوٹ آئے ہیں

مخمور سعیدی کو ہر صنفِ شعر پر عبور حاصل ہے لیکن انھوں نے غزل اور نظم سے جتنا پیار کیا ہے اتنا دیگر اصناف سے نہیں۔ غالب نے بھی غزل سے جتنا پیار کیا اتنا دوسری اصناف سے نہیں، اس کا پتہ اس بات سے بھی لگتا ہے کہ غالب نے اپنے ذاتی غم کے اظہار کے لیے غزل ہی کا انتخاب کیا ہے۔ عارف کی موت پر جو مرثیہ غالب نے لکھا ہے وہ کسی بھی حساس شخص کو رُلا سکتا ہے اور لطف یہ ہے کہ اس میں غالب نے بہ قدر شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل، جیسی کوئی بات بھی نہیں کہی۔

تو کیا اس سے ہم یہ نتیجہ نہیں نکال سکتے کہ حزن و ملال کا اظہار تو غزل میں خوب ہو سکتا ہے، لیکن قصیدہ غزل میں صرف محبوب ہی کا ممکن ہے۔ یعنی غزل بے غرض، بے مقصد اور بے لوث محبت ہی کے لیے ہے۔ خیر، یہ تو ایک الگ بحث ہے۔ مخمور سعیدی نے سیما، ان کی بیٹی، کے نہ رہنے پر جو مرثیہ کہا ہے وہ غزل ہی کے روپ میں ہے۔ یہ شاعر کے آنسو ہیں لیکن اگر مندرجہ ذیل شعر اس غزل سے الگ کر کے دیکھیں تو:

جدا ہوا تو کئی لوگ اور یاد آئے
پرانے زخم بھی تازہ کر گیا اک شخص
گلی گلی وہی چہرہ مجھے دکھائی دے
اجاڑ شہر کو آباد کر گیا اک شخص

ایک طرف مرحومہ کے غم سے بھری بھری سوکھی آنکھیں اُجاڑ ہوئی دنیا میں آبادی دیکھتی ہیں تو دوسری طرف ایک غم سے کتنے غموں کا سلسلہ نکلتا ہے۔ غزل کی یہ وسعت اسی کے ہاتھ آتی ہے جو جذبے اور زبان دونوں پر قدرت رکھتا ہو

اور روایت جس کے ادراک و احساس میں ایسے ہی بسی ہو جیسے آنکھ میں نظر۔ سیما کی یاد میں انھوں نے نظمیں بھی کہی ہیں لیکن سیما کی قبر پر انھوں نے جو شعر کہے ہیں وہ پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں:

اس خرابے میں زباں کون سمجھتا اس کی؟
خاک پر گر کے مری آنکھ کا آنسو چپ ہے
نکہتِ گل کسی زنداں میں مقید جیسے
یوں تہ قبر ترے جسم کی خوشبو چپ ہے
کہیں یہ رسمِ ملاقات تو دیکھی نہ سنی
تجھ سے ملنے کو میں آیا ہوں مگر تو چپ ہے

بچے تو سبھی کے پیارے ہوتے ہیں اور اچھے لگتے ہیں لیکن بعض بچے اپنی عادتوں اور اوصاف کے سبب ہمیشہ یاد رہتے ہیں۔ اس میں اُن کے والدین کی تربیت کا بھی بڑا دخل ہوتا ہے۔ وہبی اور کسبی اوصاف سیما میں بھی موجود تھے۔ اس میں ایک قابلِ ذکر وصف یہ تھا کہ وہ گھریلو اور روزمرہ کی زندگی میں مخمور صاحب کے مزاج سے خوب واقف تھی۔ مثلاً مخمور صاحب آواز دے رہے ہیں ''سیما میرا جوتا کہاں ہے؟'' لیکن سیما ہاتھ میں آئینہ اور حجامت کا سامان لیے کھڑی ہے۔ باہر نکلنے کو تیار کھڑے مخمور صاحب کہہ رہے ہیں ''میری گھڑی دو بیٹے'' اور مرحومہ جوتے اور جرابے لیے چلی آرہی ہے۔ میں حیرت سے اس کی طرف دیکھتا ہوں تو سرگوشی میں کہتی ہے'' آپ دیکھ رہے ہیں نا گھڑی تو ہاتھ ہی پر بندھی ہے۔'' ایسے مزاج شناس بچے جب نہ رہیں تو دکھ دونا ہو جاتا ہے۔ ان کے اس دکھ میں جو شدت ہے وہ اظہار کی سطح پر ایسا معروضی ہو گیا ہے کہ اس کا کینوس وسیع ہو گیا ہے۔

مخمور سعیدی نے غزل کے بعد سب سے زیادہ توجہ نظم پر صرف کی ہے۔ ان کی نظموں میں بیانیے کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ وہ استعارے، علامت اور ابہام کو اپنے یہاں مقدم مقام نہیں دیتے۔ اس کی وجہ بیانیہ اسلوب بھی ممکن ہے۔ لیکن ان کی نظموں میں بیانیہ کا جو روپ ہمیں ملتا ہے وہ نئی اطلاعات کا نہیں بلکہ اطلاعات کی ازسرنو ترتیب و تہذیب کا روپ ہے۔ بیانیہ کا یہ روپ بہت معمولی معلوم ہوتا ہے لیکن معمولی ہوتا نہیں ہے۔ ایسی نظموں میں شاعر کی ہنرمندی کا راز نظم کے اختتام سے کھلتا ہے۔ مخمور سعیدی نے یہ ہنر حاصل کیا ہے اور اسے ایسی چابک دستی سے استعمال کیا ہے کہ اگر اس طرف توجہ نہ دلائی جائے تو احساس ہی نہیں ہوتا کہ ان کے یہاں استعارہ اور علامت کا اتنا استعمال نہیں ہوا جتنا ان کے معاصرین کے یہاں۔ میں اسے اُن کے ادبی استحکام ہی سے تعبیر کرنا چاہوں گا۔ انھوں نے جس شعریات کو ذہن میں رچا بسا کر نظمیں کہی ہیں اس کا تقاضا ہی شاید یہ ہے کہ ابہام کم سے کم ہو، اس کے باوجود نظم کمزور نہ ہو۔ ان کے یہاں متعدد نظمیں ایسی ہیں جنھیں پڑھ کر یقین ہوتا ہے کہ ابہام اچھی نظم کا واحد وصف نہیں ہے۔ ان کی نظم نگاری پر مفصل گفتگو تو یہاں ممکن نہیں لیکن کچھ نظموں کے عنوان رقم کیے جاتے ہیں۔ ''وہ شہراب بھی اسی جگہ ہے''، ''ایک اچھا شہری''، ''سفر بہت طویل ہے''، ''زمیں کا یہ ٹکڑا''، ''خزاں کا موسم''، ''سمندر کا نوحہ سنو''، ''اندھا سفر''، ''سفر کا آخری منظر''، ''ہوا کو نہ روکو''، ''ہمزاد''، ''اور بھی غم ہیں''، ''کربلا''، ''اسلوب''، ''ایک فریب خوردہ کردار کا دکھ''، ''یادیں خوابوں کی دشمن ہیں''، ''چڑیا''، ''شکست''، ''اندھیری رات کا جنگل''، ''دو چہرے''، ''ردِ عمل''، ''موسمِ بہار کی ایک نظم''، ''دشمن''، ''ایک بدشگون صبح''، ''جلد باز''، ''ڈھلتی عمر کی ایک نظم''، ''گمشدہ آدرش''۔ وغیرہ جن کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ مخمور نے نظم کے Metonymic عناصر سے استعارہ کا کام کس طرح لیا ہے۔ یہ وہ چند نظمیں ہیں جو اس وقت ذہن میں ہیں اس لیے ان کی نظم نگاری کی تفہیم میں اس فہرست کو آخری نہ مانا جائے۔

''دیوار و در کے درمیاں'' پر تبصرہ کرتے ہوئے شمس الرحمٰن فاروقی نے مخمور سعیدی کی غزل کے متعلق کہا ہے:

''مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ غزل میں مخمور سعیدی اپنی پوری تخلیقی قوت صرف کر دیتے ہیں، ان کی غزل تک تک سک سے درست تو ہوتی ہی ہے، اس میں الفاظ اور مصرعوں کا دروبست عام طور پر غیر معمولی تو ہوتا ہی ہے، بڑی بات یہ ہے کہ'' دیوار و در کے درمیاں'' کی غزلوں میں جو پختگی، آسانی سے بات کہنے کی ادا، اور آزادروانی ہے وہ مخمور سعیدی کا اپنا کارنامہ ہے، اس پر کسی معاصر غزل گو کی پرچھائیں نظر نہیں آتی۔'' اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ فاروقی صاحب کو ان کی نظم کم پسند ہے یا ان کی نظر میں ان کی نظم کمتر ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''مخمور سعیدی کے بارے میں میرا خیال تھا کہ ان کی غزل میں جو پختہ کارانہ رنگ روپ، مفکرانہ ٹھہراؤ، اور استعاراتی کیفیت ہے، وہ ان کی نظم میں نہیں۔'' دیوار و در کے درمیاں'' نے میرا یہ خیال غلط کر دیا ہے۔ مخمور سعیدی کی نظم میں اب وہ ارتکاز، کم گوئی میں کثیر المعنویت اور شدت احساس کے ساتھ ساتھ بالواسطگی نظر آنے لگی ہے جو جدید نظم کو گزشتہ نسل کی نظم سے الگ کرتی ہے۔''

دیوار و در کے درمیاں'' مخمور سعیدی کا اب تک شائع ہوئے مجموعہ ہائے کلام میں آخری مجموعہ ہے۔ یہ مجموعہ 1994 میں منظرِ عام پر آیا تھا۔ اس سے پہلے 1983 میں'' بانس کے جنگلوں سے گزرتی ہوا'' منظرِ عام پر آیا تھا۔ اس مجموعے میں بھی انھوں نے قریب قریب وہی باتیں کہی ہیں جو انھوں نے ''واحد متکلم'' (مطبوعہ 1979) میں کہی تھیں مثلاً:

''ہمارے ہاں غیر ادبی بنیادوں پر ادبی فیصلے صادر کرنے کا سلسلہ ترقی پسند تحریک کے ساتھ شروع ہوا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین عالمی اشتراکی تحریک کا ایک محاذی ادارہ تھی اور یہ ادب کو اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کرنا چاہتی تھی۔ ترقی پسندوں نے ایسے ادیبوں اور شاعروں کو آگے بڑھایا جو اپنی فن کارانہ ذمے داریاں بھلا کر کلیتاً ان کے ہمنوا ہو گئے۔ فنی پیمانے پس پشت ڈال دیے گئے اور سیاسی نعرہ زنی کو شعر و ادب کی کسوٹی قرار دے دیا گیا......

......لیکن موجودہ ادبی صورتِ حال کا ایک پہلو نہایت افسوسناک ہے۔ کچھ لوگوں نے جدید شعر و ادب کی قدر شناسی کا قرعہ خود اپنے نام نکال لیا اور اس کو قدر شناسی کی کسوٹی بنایا ''کس نے کہا؟'' کو۔''

آپ نے دیکھا ہوگا کہ انھوں نے ہر بار ادبی صورت حال سے اپنے قارئین کو باخبر کیا ہے، اور جو محسوس کیا اسے بے لاگ بیان کیا۔ ترقی پسند تحریک سے پہلے ادب کا معیار ''کیسے کہا'' تھا۔ ترقی پسند عہد میں ''کیا کہا'' کو مقدم قرار دیا گیا لیکن بیسویں صدی کے آخری برسوں تک پہنچتے پہنچتے ''کس نے کہا'' کو معیار مان لیا گیا۔ جینوئن (Genuine) شاعر ہی کا نہیں جینوئن قاری کا بھی یہی مسئلہ ہے غیر ادبی بنیادوں پر ادبی فیصلے اور تعصب نے ہمارے ادب میں جو صورت حال پیدا کر دی ہے وہ ہمارے سامنے ہے۔ ہم سب اس سے واقف ہیں مگر خاموشی اختیار کیے رہتے ہیں۔ ہماری خاموشی سے ہمیں تو شاید فائدہ پہنچتا ہے لیکن ادب کو اس سے نقصان پہنچتا ہے۔ سب سے بڑا نقصان تو یہی پہنچتا ہے کہ ادب کی پرکھ اور پہچان میں ناانصافی در آتی ہے، اور ادیب کا ادب ہی سے ایمان اٹھنے لگتا ہے اور وہ بھی ادب کے غیر ادبی معیار پر یقین کرنے لگتا ہے۔ بجائے ریاض کے وہ فیض رسانی کے راستے کھوجنے لگتا ہے جس سے فن کی جڑیں کمزور ہونے لگتی ہیں، ایسی صورت حال میں مخمور سعیدی کی مثالی ذات غنیمت ہے۔ وہ دنیاداری پر فن کو ترجیح دیتے ہیں، فاروقی صاحب کا یہ فرمانا کہ:

''مخمور سعیدی کے مزاج میں درویشی ہے، وہ ان باریکیوں سے بے خبر صرف عرض ہنر کیے جا رہے ہیں، کاش ان کی طرح کے دو چار لوگ ہمارے معاشرے میں اور ہوتے۔''

بالکل صحیح ہے۔ کاش کہ ایسا ہوا ہوتا۔

(بشکریہ ''بھیڑ میں اکیلا آدمی'')

□□□

عبدالحلیم شرر ـــــ بحیثیت ناول نگار

مصنف: علی احمد فاطمی

اس کتاب میں مصنف نے عبدالحلیم شرر کے ناولوں کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ پیش کیا ہے۔ موصوف نے شرر سے قبل کی سیاسی، سماجی اور ادبی صورت حال کے جائزے میں شرر کے حالاتِ زندگی، خاندانی پس منظر، ملازمتوں اور علمی مشاغل، سفر انگلستان اور قیام حیدرآباد نیز ان کی بعض اہم تحریروں کی اوّلین اشاعت جیسے امور سے تفصیلی بحث کی ہے۔

صفحات: 393، قیمت: -/165 روپے

آزادی کے بعد اردو طنز و مزاح

مرتب: ابوالکلام قاسمی

پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے آزادی سے تقریباً ربع صدی قبل سے نصف صدی بعد تک کے معتبر طنزیہ و مزاحیہ مضمون نگاروں کو اس کتاب میں یکجا کیا ہے، جن میں انجم مانپوری، ملا رموزی، رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، شوکت تھانوی، کنھیا لال کپور، فکر تونسوی، حسنین عظیم آبادی، ابراہیم جلیس، یوسف ناظم، احمد جمال پاشا، مجتبیٰ حسین، شفیقہ فرحت اور اعجاز علی ارشد جیسے 25 قلم کاروں کی تخلیقات شامل ہیں۔ اس انتخاب سے آزادی کے بعد لکھے جانے والے مزاحیہ ادبی سرمایے کی ارتقائی منازل کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ متن اردو اور ہندی دونوں رسم الخطوں میں ہے۔

صفحات: 655، قیمت: -/457 روپے

فضل الرزاق خاں ارشد

ایسا کہاں سے لاؤں...

بلاشبہ سلطان محمد خاں مخمور سعیدی کا سانحۂ ارتحال اردو شعروادب کا بڑا نقصان ہے،لیکن میرے لیے یہ سانحہ ایک الگ نوعیت کا ہے۔ یہ مجھ پر قیامت ٹوٹ پڑنے جیسا ہے۔ میرے برادرِ حقیقی مخمور سعیدی — جنھیں میں 'بھائی' کہتا تھا— میں نے آنکھ کھولی تو انھی کو دیکھا کیونکہ ہمارے درمیانی بھائی بہن کم سنی میں ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ جب میں نے ہوش سنبھالا بھائی دہلی آباد کر چکے تھے۔ میرے ذہن میں ان کے کچھ دھندلے دھندلے نقوش محفوظ تھے۔ کچھ کچی پکی یادیں اور کچھ سنے سنائے قصے، اور بس۔

17 دسمبر 1959 کو والد صاحب کا انتقال ہوا۔ اس بار بھائی ٹونک آئے تو کچھ زیادہ دن تک رہے اور واپسی پر مجھے اپنے ساتھ دہلی لیتے گئے، چونکہ والدہ ابھی عدت میں تھیں اس لیے بھابی کو یہیں ٹونک چھوڑ دیا۔ والد مرحوم بیحد سخت گیر اور اصولی آدمی تھے۔ زندگی بسر کرنے کے ان کے اپنے آداب تھے جن کی پابندی افرادِ خاندان کے لیے بھی ضروری تھی۔ جس سے میں پریشان رہتا تھا۔ دہلی میں بھائی کا برتاؤ والد صاحب سے بالکل جداگانہ تھا۔ انھوں نے اتنا پیار اور محبت نچھاور کی جس میں میں شرابور ہو گیا اور ماضی کی ساری سراسیمگی اور ہراس بھول کر میرے دل کا وہ ڈر جاتا رہا جو والد صاحب کے رویے سے پیدا ہو گیا تھا۔

چونکہ میری کم سنی میں ہی والد صاحب کا انتقال ہو گیا تھا اور بھائی اسے محسوس کرتے ہوں گے اس لیے میرے تئیں ان کا رویہ برادرانہ کم اور پدرانہ زیادہ رہا۔ میری چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کا خیال رکھتے اور انھیں پورا کرنے کو کوشاں رہتے۔ 1960 سے زندگی کے آخری لمحے تک میرے خیال میں انھوں نے اپنے آپ سے زیادہ میرے اور میرے بچوں کے بارے میں ہی سوچا ہوگا۔ وہ جہاں بھی ملازم رہے مجھے بھی اپنے ساتھ کام دلا کر ہمیشہ اپنی آنکھوں کے سامنے رکھا۔

''تحریک'' بند ہوا تو بھائی دیگر رسائل کی طرف رجوع ہوئے اور میں پریم گوپال متل صاحب کے ساتھ موڈرن پبلشنگ ہاؤس سے وابستہ ہو گیا، لیکن 1988 میں جب دہلی اردو اکادمی نے اپنا جریدہ ''ایوانِ اردو'' جاری کیا اور بھائی کو اس کا مدیر مقرر کیا گیا تو بھائی نے پہلا کام مجھے وہاں بلانے کا ہی کیا۔ میں 93-92 تک پھر سے ان کے دن رات کا شریک بن گیا لیکن ایک ناخوشگوار واقعے کے بعد جب میں نے صرف اکادمی ہی نہیں دہلی چھوڑنے کا فیصلہ کیا تو بھائی بہت رنجیدہ ہوئے۔ اکادمی چھوڑنے پر نہیں، دہلی چھوڑنے پر۔ میں نے اس وقت تو اپنا دوسرا ارادہ ترک کر دیا لیکن بعد میں میرے لیے مستقل دہلی رہ پانا ناممکن ہو گیا تو انھوں نے بادلِ نخواستہ جانے کی اجازت دے دی، لیکن اس شرط کے ساتھ کہ میں ماہ بماہ دہلی آتا رہوں گا۔

اکادمی سے سبکدوشی کے بعد جب بھائی قومی اردو کونسل سے وابستہ ہوئے تو یہاں بھی میرے لیے راہیں ہموار کیں اور مجھے کونسل سے پروف ریڈنگ کا کام ملنے لگا۔ انھوں نے NBT، ساہتیہ اکادمی اور راجستھان اردو اکادمی سے بھی ہر ممکن کام مجھے دلوایا۔ ٹونک میں جب میں نے اپنا مکتبہ قائم کیا تو اس میں بھی ہر طرح کی معاونت کی اور اشاعت کے کئی کام دلوائے۔ وہ میری کثیر العیالی سے بڑے فکرمند تھے اس لیے چاہتے تھے کہ جہاں جہاں سے جیسے بھی ہو مجھے کام ملتا رہے۔ میرے تینوں لڑکوں کے روزگار کی فکر بھی انھیں لاحق تھی اور ان کے قدم جمانے میں مالی معاونت سے بھی گریز نہ تھا لیکن کہتے تھے کہ ابھی تین بیٹیاں بیٹھی ہیں ان کے بارے میں پہلے سوچنا ہے۔ اس لیے ہاتھ کھینچ کر رکھتے تھے— مجھے دیکھیے میں ان سارے معاملات سے بالکل بے فکر تھا کیونکہ ذہن میں تو بیٹھا یہ ہوا تھا کہ اس طرح کے سارے مسائل تو حضرت مخمور سعیدی کے ہیں جو انھی کو حل کرنے ہیں۔ کیا پتہ تھا کہ وہ یوں چپ چاپ رخصت ہو لیں گے، مجھے ان مسائل کا حل بتائے بغیر۔

چھ سات فروری کی درمیانی شب کو بھائی نے پہلی بار مانا کہ ان کی طبیعت واقعی خراب ہے۔ میں نے علاج کے بابت معلوم کیا تو کہنے لگے ''ابھی تک تو یہیں کا علاج کر رہا تھا، اب جناب ولی بجنوری کے صاحبزادے ڈاکٹر ایم. ولی سے وقت لیا ہے جو رام منوہر لوہیا اسپتال کے سرجن ڈاکٹر ہیں اور وہاں پڑھاتے بھی ہیں، کل انھیں دکھاؤں گا۔'' نو فروری کو پھر بات ہوئی تو کہنے لگے— ''میں نے انھیں دکھا لیا ہے؛ انھوں نے کچھ ٹیسٹ بتائے ہیں وہ کراتا ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''میں آجاتا ہوں'' تو بولے۔ ''تم کیوں تکلیف کرتے ہو، میں کرالوں گا۔'' لیکن میں نہیں مانا اور 12 فروری کی صبح دہلی پہنچ گیا۔ یہ ٹیسٹ میرے پہنچنے پر ہی ہوئے کیونکہ بھائی نے چاہے زبان سے مجھے آنے سے منع کر دیا تھا لیکن دل سے وہ یہی چاہتے تھے کہ میں آؤں، دل سے تو انھوں نے کبھی بھی نہ چاہا کہ میں ان سے جدا رہوں۔ نزلے اور کھانسی کی شدت کی وجہ سے ڈاکٹر موصوف کو TB کا شک تھا جو ٹیسٹ کی رپورٹوں سے غلط ثابت ہوا انھوں

نے کچھ دوائیں تجویز کیں جو بے اثر ثابت ہوئیں۔ حالت یہ تھی کہ بھائی بستر پر کچھ دیر کو بھی لیٹ نہیں پاتے تھے اور ساری رات بیٹھے بیٹھے گزرتی تھی۔ میں اور پیارے میاں (بھائی کے سالے اور ہمارے خالہ زاد بھائی) اور میری بیٹی رضوانہ ان کو بیٹھے سہلاتے رہتے، دباتے رہتے لیکن بھائی کو کسی کل چین نہ پڑتا کبھی کبھی وہ اپنی موت کی دعا کرنے لگتے تھے۔

بھائی کی تکلیفوں کے بارے میں جو سنتا بے چین ہو اٹھتا، چندر بھان خیال صاحب نے پرمانند اسپتال میں دکھانے کا مشورہ دیا جہاں ان کے ایک واقف تھے اور سریندر ڈھجر صاحب نے ایک وئید صاحب کی بابت بتایا جنھیں وہ اچھی طرح جانتے تھے۔ جے پور کے کئی لوگوں کا مشورہ تھا کہ وہاں کے ڈاکٹر سرکار کو دکھایا جائے جو پھیپھڑوں کے ماہر ڈاکٹر ہیں۔ گورنمنٹ ٹی. بی اسپتال سے سبکدوشی کے بعد انھوں نے شہر کے تین مختلف علاقوں میں اسی علاج کے کلینک کھولے ہوئے ہیں۔ غرض ہر کوئی یہ چاہتا تھا کہ بھائی کسی طرح صحت یاب ہو جائیں اور جلد سے جلد صحت یاب ہو جائیں۔ بھائی جے پور جانے پر آمادہ نہ تھے، لیکن جب منہ بولی بیٹی شاداب نے، جو ان کی عیادت کو ان دنوں آئی ہوئی تھی، بہت ضد کی تو وہ آمادہ سے نظر آئے لیکن انھوں نے پہلے خیال صاحب کو فون کیا اور پوچھا کہ پرمانند اسپتال میں انھوں نے بات کی؟ بعد میں خیال صاحب نے بتایا کہ انھوں نے معلوم کیا تو پتہ چلا کہ ان کے واقف کار تو ہولی سے چھٹی پر تھے۔ خیال صاحب نے جمنا پار کے ایک اسپتال کا نام تجویز کرتے ہوئے کہا کہ فی الحال، وہاں رجوع کر لیں، ایک دو روز بعد یہاں (پرمانند اسپتال) میں انتظام ہو جائے گا۔ اب آگے کا معاملہ خدا پر چھوڑتے ہوئے بھائی نے جے پور جانے کا فیصلہ کر لیا۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ میں یہیں رک جاؤں وہ دو روز بعد تو واپس لوٹ ہی آئیں گے۔ انھوں نے کہا تھا — ''اس بار میری وجہ سے تم اپنا کوئی کام بھی نہیں کر سکے ہو، وہ کر لینا، پھر تم یہاں رہو گے تو گھر کی دیکھ بھال بھی ہوتی رہے گی، مجھے اطمینان رہے گا۔ میرے پیڑوں کو پانی اور کبوتروں کو باقاعدہ دانہ ڈالتے رہنا۔ میں دو دن بعد تو آ ہی رہا ہوں۔'' میں اس بات پر آمادہ بھی ہو گیا تھا لیکن میرے منجھلے بیٹے فیصل نے تنبیہ کی کہ مجھے ساتھ جانا چاہیے اس سے پاپا (میرے بچے بھائی کو یہی کہتے ہیں) کو سہولت رہے گی اور دل بھی لگا رہے گا۔ میں رکنے پر بھائی سے آمادگی ظاہر کر چکا تھا اس لیے تذبذب میں تھا کہ کیا کروں، دل میرا بھی نہیں مان رہا تھا۔ مجھے خاموش اور نم دیدہ دیکھ کر خود بھائی ہی بولے — ''کیا بات ہے'' تو میرے آنسو پھوٹ بہے، خود بھی افسردہ ہوئے اور کہا۔ ''یہ کیا بات ہوئی، چلنا چاہتے ہو تو چلو، میں تو یوں کہہ رہا تھا کہ تمھارے کام کا بہت حرج ہو چکا ہے۔'' انھیں اپنی اس تکلیف میں بھی میری اور میرے کام کے حرج ہو جانے کی زیادہ فکر تھی۔

جے پور میں ڈاکٹر نے دہلی کی رپورٹیں غور سے دیکھتے ہوئے تیکھے لہجے میں کہا — ''وہ کون ڈاکٹر تھا جس نے یہ رپورٹیں دیکھ کر بھی پانی نہیں نکالا۔'' اس نے ارجنٹلی بلڈ پریشر چیک کرا کے خون میں شکر کی مقدار جاننے کے لیے خون کا ٹیسٹ اور ایک اور ایکسرے کرانے کی تاکید کی جو اسی کے کلینک پر ہوتی تھیں۔ بلڈ کی رپورٹ شام کو ملنی تھی لیکن ایکسرے ہاتھوں ہاتھ مل گیا، اس ایکسرے سے معلوم ہوا کہ دل کا آکار بھی کچھ بڑھ گیا ہے۔ منجھے نے یہ بات آکر مجھے اور بھائی کو بھی بتائی۔ ڈاکٹر نے ایک نئی جانچ تجویز کی جس کی سہولت اس کی کلینک پر دستیاب نہیں تھی۔ اس نے دوائیں بھی لکھیں اور کہا کہ کل یہ رپورٹیں لے آئیں تب فیصلہ کروں گا کہ پانی کب اور کیسے نکالنا ہے۔ ہم نے باہر سے تجویز کردہ دوائیں خریدیں اور 'ایکوٹیسٹ' کے لیے روانہ ہو گئے۔ اس دوران بھائی تقریباً بے سدھ رہے۔

ایکوٹیسٹ کے لیے متعلقہ مقام تک پہنچے تو معلوم ہوا کہ ان کا لنچ ہو چکا ہے اور اب ٹیسٹ ساڑھے چار بجے ہوگا۔ بھائی گاڑی کی اگلی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے بے سدھ ہو کر جھونکے کھاتے رہے تھے اس لیے واپسی پر میں نے انھیں پیچھے اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ گھر کے قریب پہنچے تو بھائی نے مجھ سے کہا'' کھانے کے لیے کچھ لے لیا جائے۔'' وہ منجھے شاداب کو زیادہ زیر بار کرنا نہیں چاہتے تھے۔ گاڑی رکی تو میں نے اپنے بیٹے شعیب کو سامان لانے بھیج دیا اور اسے لوٹنے میں کچھ دیر ہوئی تو بھائی نے کہا — ''یار، تم نے بھی کس احمق کو بھیجا ہے۔'' یہ میرے بھائی کے آخری الفاظ تھے جو میرے کانوں نے سنے، گھر پہنچ کر وہ گاڑی سے اترے اور سیدھے پیشاب گھر کی طرف بڑھے۔ اترنے سے قبل وہ چھڑی تلاش کی جو گاڑی میں رکھی تھی اور جسے ہماری بھابی استعمال کرتی تھیں اور انھوں نے اسپتال جانے کے لیے بھائی کو دے دی تھی تاکہ چلنے میں آسانی رہے۔ میں پیچھے پیچھے ان کے ساتھ تھا، پیشاب گھر کے دروازے پر انھوں نے چھڑی مجھے پکڑوا کر جیسے ہی اندر قدم رکھنا چاہا ان کا پاؤں دروازے کی منڈیر سے ٹکرایا۔ انھوں نے جھٹکے کے ساتھ سنبھلنا چاہا، میں نے ہاتھ کا گھیرا بھی بنایا لیکن دوسرے ہی لمحے بڑی سرعت سے وہ اوندھے منہ گر پڑے، چشمہ چکنا چور ہو گیا اور میرے کمزور ہاتھوں سے ان کا جسم پھسل گیا اور وہ بے قرار روح جو اولاد کے سکھ سے محروم رہی تھی اپنی ساری محرومی کے ساتھ پرواز کر گئی۔ انا للہ و ان الیہ راجعون۔

□□□

پتہ:
Meer Alam Khan Mension
Ameer Ganj,
Tonk, (Rajasthan)

فاروق ارگلی

اردو شعر و ادب کا اہم ستون تھے: مخمور سعیدی

بھیڑ میں یوں تو وہ اکیلا تھا
اس کا قد دوسروں سے اونچا تھا

ہر متنفس کو بالآخر موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ یہی قانون الٰہی ہے اور یہی زندگی کی سب سے بڑی حقیقت۔ ہم آئے دن اپنے عزیزوں، دوستوں اور محبوں سے بچھڑتے رہتے ہیں۔ ناگہانی حادثات، آفات سماوی، فساد، جنگ اور دہشت گردی سے مرنے والوں کی خبروں سے دوچار ہوتے رہتے ہیں۔ موت چونکہ زندگی کا حصہ ہے، اس لیے ہمارے ذہنوں پر کچھ زیادہ اثر نہیں ہوتا۔ لیکن کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کی موت ہمیں لرزہ براندام کر دیتی ہے، ہر طرف عجیب سے سناٹے، اندھیرے اور ایک ناقابل تلافی نقصان کا احساس ذہن وشعور پر طاری ہو جاتا ہے۔

اردو شعر و ادب کی انتہائی باوقار، محبوب اور محترم شخصیت جناب مخمور سعیدی کے اچانک انتقال سے ان کے ہزاروں چاہنے والے، ان کے اعزا، اقربا، احباب اور ساتھی ایسے ہی جانگسل احساس میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ کسی کو یقین نہیں آرہا کہ مخمور سعیدی جیسا زندہ دل، خوش خلق، خاص و عام کے دلوں میں بسنے والا، اردو دنیا کا عظیم شاعر، ادیب، ناقد اور صحافی اب اس دنیا میں موجود نہیں ہے اور اردو کے اس عہد زوال کی دلی علم و آگہی کے وقار اور عظمائے سلف کی اعلیٰ اقدار و روایات کے آخری روشن چراغ سے محروم ہو چکی ہے۔ اب برسوں تک شعر و سخن کی محفلوں اور مشاعروں میں ان کی کمی شدت سے محسوس کی جاتی رہے گی۔ مخمور سعیدی اپنی محنتوں، ریاضتوں اور تخلیقی رفعتوں کی جو لازوال نشانیاں اپنی شاعری اور علمی ادبی تحریروں کی صورت میں چھوڑ کر گئے ہیں وہ اردو دنیا میں انھیں ہمیشہ زندہ رکھیں گی اور اپنی انسانی خوبیوں، نیکیوں اور ہزاروں چاہنے والوں کی محبتوں کی بے پایاں دولت اپنے ساتھ لے گئے ہیں، اللہ غفور الرحیم ہے، وہ ضرور انھیں جوار رحمت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے گا۔

مجھے یہ ادعا نہیں کہ مخمور صاحب سے قریبی دوستی کا شرف حاصل تھا۔ البتہ یہ پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ان سے شناسائی، احترام وعقیدت کا رشتہ کم وبیش چالیس سال پرانا تھا اور ان کے بہت سے حلقہ بگوشوں کی طرح مجھے بھی ان کی شفقت، مشاورت اور رہنمائی مسلسل حاصل رہی۔ آج سے بیس پچیس سال پہلے جب اوروں کی دیکھا دیکھی شاعری کا شوق ہوا تو مخمور بھائی ہی سہارا بنے۔ حوصلہ بڑھانے کے لیے میری فضول گوئی کی داد دیتے اور غلطیوں کی اصلاح اس طرح کرتے کہ گرفت کا احساس تک نہ ہو۔ سچ کہوں تو مخمور سعیدی کے بعد اردو فارسی لسانیات، عروض و بلاغت کا ماہر اور ادبیات عالم پر گہری نظر رکھنے والا صاحب فکر شاعر دلی میں اب دوسرا نہیں رہا ہے۔ وہ میری طرح بہت سوں کے پیارے دوست ہونے کے ساتھ ساتھ مشفق استاد بھی تھے، جانے کتنوں کو تراش کر، سجا سنوار کر علم و ادب کی دنیا میں شناخت عطا کی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے جب امیر آغا قزلباش جیسے البیلے شاعر کی اٹھان کا زمانہ تھا، ان کی چند غزلوں اور نظموں نے دھوم مچا رکھی تھی، امیر کو مجموعۂ کلام چھپوانے کی شدید آرزو تھی، جب کہ ان کی کل شاعرانہ جمع پونجی تھی، چھ سات غزلیں اور تین چار نظمیں۔ پھر ایک دن دیکھا کہ دونوں اصحاب ''گلفام'' کے دفتر میں جم گئے۔ تین دن رات وہیں قیام اور کھانا پینا رہا، آغا مصرعہ اٹھاتے، مخمور گرہ لگاتے، وہ شعر کہتے یہ لفظ اور مفہوم بدل کر اس میں جان ڈال دیتے، چوتھے دن مجموعہ کاتب کے حوالے تھا۔ مخمور کے پیارے دوست آغا صاحب دیوان ہو گئے۔

اردو دنیا مخمور سعیدی کی علمی، ادبی اور تخلیقی عظمت کا اعتراف کر چکی ہے۔ یہ عظمت انھوں نے اپنی خداداد، ذہانت، لگن اور ریاضت سے خود حاصل کی۔ وہ بیک وقت اردو غزل کے معتبر شاعر اور منفرد لہجہ وآہنگ کے نظم نگار کی حیثیت سے بین الاقوامی شہرت کے حامل تھے، لیکن ادبی صحافت، تنقید، ترجمہ اور ترتیب و تدوین کے حوالے سے بھی ان کی مہارت کے روشن نقوش عصری اردو منظر نامے پر ثبت ہیں۔ اردو کے نظریہ ساز ماہنامے ''تحریک'' سے لے کر گلفشاں، نگار، ہماری زبان، نخلستان، ایوان اردو، امنگ، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے جرائد، اردو دنیا اور فکر و تحقیق تک ان کی اعلیٰ صحافتی خدمات کی ناقابل فراموش تاریخ ہمارے سامنے ہے۔ گفتنی، سیہ بر سفید، سب رنگ، واحد متکلم، آتے جاتے موسموں کی صدا، بانس کے جنگلوں سے گزرتی ہوا، عمر گزشتہ کا حساب، راستہ اور میں جیسے لافانی شعری مجموعے اور دو درجن سے زائد اہم علمی، ادبی کتابیں، لاتعداد مضامین و مقالات شہرت عام اور بقائے دوام کے دربار میں انھیں اعلیٰ ترین مقام و مرتبہ عطا کر چکی ہیں۔ تمام اکیڈمیوں، انجمنوں اور ساہتیہ اکادمی کے ایوارڈز و اعزازات ان کی غیر معمولی علمیت اور تخلیقیت کا اعتراف و اظہار ہیں۔ لیکن اس عظیم شاعر اور عہد حاضر کے جینئس کی نجی زندگی اتار چڑھاؤ اور سانحات سے گزرتی رہی۔ شادی کے آٹھ سال بعد اللہ تعالیٰ

نے فرزند سے نوازا،مگر چند ماہ کی خوشی دے کر دنیا سے چلا گیا۔ اولاد سے محرومی کا مداوا پیاری سی بھتیجی کو گود لے کر تلاش کیا۔ پالا پوسا، خوبصورت، ذہین اور خدمت گار بچی سیما 18 سال کی عمر میں ایک حادثے کی شکار ہوکر چل بسی۔ بے پناہ غموں نے مخمور کو شراب میں ڈبو دیا، مخمور کی مے نوشی داستان بن گئی، شاید وہ مجاز، نریش کمار شاد، سلام مچھلی شہری اور امیر قزلباش جیسے دریانوشوں کی طرح شراب کے سمندر میں غرق ہوجاتے لیکن اللہ تعالی کی بے پایاں رحمت نے بچا لیا۔ حج وزیارت کی سعادت نے انھیں تمام دنیوی آلائش سے پاک کردیا۔ وہ ایک سچے، پاکیزہ کردار مومن کی طرح دنیائے فانی سے رخصت ہوئے۔ وہ عصر رواں کا آئینہ بن کر جیے اور زندگانی کی رہگزر سے وقت بن کر گزر گئے۔ وہ اپنی یادوں کا مہکتا ہوا گلستاں چھوڑ گئے، جس کی دائمی خوشبو مشام روح وادراک کو معطر کرتی رہے گی اور مجھ جیسے ہزاروں ان کا ذکر اس طرح کرتے رہیں گے:

ہیں آج بھی دنیا میں سخنور تو ہزاروں
یاں ذکر ہے مخمور سعیدی کے سخن کا
تنہا تھا بھری بھیڑ میں پر سب سے نمایاں
بارات میں دولہا سا تھا وہ فن کی دلہن کا
جو لفظ بھی مخمور کے اشعار میں آیا
موتی ہے وہ بصرے کا کہ ہے لعل یمن کا

آج پوری اردو دنیا میں مخمور سعیدی کا ماتم منایا جارہا ہے۔ تعزیتی جلسے منعقد ہورہے ہیں۔ مخمور صاحب کی اہلیہ محترمہ سعید النساء بیگم کے نام ہزاروں غمگساروں کے اشک آلود تعزیتی پیغامات موصول ہورہے ہیں تو جانے کیوں میرا جی چاہ رہا ہے کہ لوٹ غم دیاس میں ڈوبی ہوئی اردو کو بھی پرسہ دیں جو مخمور جیسے اپنے لائق فرزند کے غم میں نوحہ کناں ہے۔

❑❑❑

بہادری کے کارنامے

مصنف: منوج داس/ مترجم: ایس۔ایم۔احمد

ہمارے ملک کو انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کے لیے لاتعداد قربانیاں دینی پڑی ہیں۔ جن سورماؤں نے اپنی جان آزادی وطن کے لیے نچھاور کی، ان کی ایک طویل فہرست ہے۔ زیر نظر کتاب میں جدوجہد آزادی کے ابتدائی دور کے ایسے ہی بہادر سپوتوں کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔

صفحات: 83، قیمت-/25 روپے

منتخب التواریخ (جلد اوّل، دوم وسوم)

مؤلف: ملا عبدالقادر بدایونی/ مترجم: ڈاکٹر علیم اشرف خاں

عبدالقادر بن ملوک شاہ بدایونی نہ صرف باکمال شاعر تھے بلکہ تاریخ نویسی میں بھی انھیں ملکہ حاصل تھا۔ معروف مورّخ ابوالفضل کے ہمعصر ہونے کے ساتھ ساتھ انھیں بھی اکبری دربار میں رسائی حاصل تھی۔ انھیں ترجمہ اور تالیف پر مامور کیا گیا تھا۔ اسی دوران انھوں نے تاریخ الفی، رزم نامہ، جامع رشیدی اور بحرالاثمار جیسی کتابیں لکھیں۔ اکبری عہد کی ساٹھ سالہ تاریخ سے آگاہی کے لیے ابوالفضل کے ''اکبرنامہ'' کے ساتھ ساتھ ملّا عبدالقادر کی ''منتخب التواریخ'' (تین جلدوں میں) کا مطالعہ بھی ناگزیر ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ملّا عبدالقادر نے یہ تاریخ شاہی محل میں بیٹھ کر نہیں لکھی جو بادشاہ اکبر کی پسند و ناپسند سے گزرتی بلکہ آزادانہ تحریر کی اور یہی آزادانہ رائے اس کتاب کو ''اکبرنامہ'' سے منفرد کرتی ہے۔

صفحات: جلد اوّل 409 / جلد دوم وسوم 620، قیمت: جلد اوّل-/335 روپے/ جلد دوم وسوم 555 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،نئی دھلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ھے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ھے۔ ادارہ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

آبگینہ نظر

خالی کرسی

میرے پاس ان سے تعلقات کے سلسلے میں برسوں کی شہادت نہیں تھی۔ لیکن یہ صرف ان ہی کی شخصیت کا کمال تھا کہ مجھے یہ لگتا ہے کہ میں جانے کب سے ان کو جانتی ہوں اور اب بھی اپنے اطراف میں انھیں کہیں محسوس کرتی ہوں۔ ہر صبح کونسل میں ان کے آنے کا انتظار رہتا ہے، کیونکہ وہ جس طرح اٹھ کر چل دیے شاید ہی کوئی ایسے جاتا ہوگا۔ یہ کہا ہی نہیں کہ میں واپس نہیں آؤں گا۔ ان آخری دنوں میں جب بھی بات ہوئی بس یہ ہی کہتے تھے کہ "میں آؤں گا" یہ تو وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اپنے وعدے سے یوں مکر جائیں گے کہ نہ دل کو یقیں ہوگا نہ آنسوؤں کو قرار۔ آج بھی جب قومی اردو کونسل کے مجلس ادارت کے اس کمرے کی گھڑی میں گیارہ بجتے ہیں تو بے اختیار میری نگاہ ان کی اس خالی کرسی کی جانب ٹھہر جاتی ہے جہاں کچھ دن پہلے وہ پر وقار، وجیہہ، مرد آہن اردو زبان کا جہادی اپنی پوری آب وتاب سے جلوہ افروز تھا۔ آج بھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک ادائے بے نیازی سے ہمیشہ کی طرح کمرے میں داخل ہوں گے، مسکراتا ہوا ملیح چہرہ، کشادہ پیشانی اور ذہین آنکھیں، پابند عہد، اپنی کرسی پر آ بیٹھیں گے اور سلام کا پرجوش جواب دیں گے، میں رُکنیت کی چائے پی کر واپس آتی تو وہ شفیق، سرپرست، کرسی پر براجمان ہوتا۔ ان کو دیکھ کر ہر دن ایک نیا جوش نیا ولولہ پیدا ہوتا کیونکہ وہ خود میں تربیت اور تعلیم کا مرکز تھے۔ جہاں ان سے سیکھنے کو اتنا کچھ تھا کہ دامن کم پڑ جائے۔

مخمور سر کے دن کی شروعات اپنے گھر سے نکل کر کونسل کے دفتر پہنچنے سے ہوتی۔ یہاں جیسے ہی کمرے میں داخل ہوتے۔ اپنی میز پر موجود لیمپ کو جلواتے، جب کہ ان کی پشت پر ایک Tube Light بھی موجود تھی اور اسی طرف ایک کھڑکی بھی کھلتی تھی، لیکن کبھی بھی وہ کھڑکی کے کھلنے یا بند ہونے سے غرض نہیں رکھتے تھے۔ کیونکہ جو روشنی انھیں چاہیے تھی وہ کہیں خود ان کے اپنے اندر ہی پنہاں تھی، کبھی کبھی تو وہ لکھتے وقت اتنے کھو جاتے کہ اپنے اطراف سے بالکل بے خبر ہو جاتے، تب آواز دے کر انھیں بلانا پڑتا، اور وہ کسی فرماں بردار بچے کی طرح حقیقی دنیا میں لوٹ آتے۔

دفتر آتے ہی اپنی میز پر موجود مطلوبہ روز نامہ، ہمارا سماج اٹھاتے اور اسی دوران بیڑی سلگا لیتے، سرخیوں کے ساتھ ساتھ بیڑی کا مزا بھی لے لیتے۔ یہ وقت یہ مختصر سا وقت صرف وہ وقت تھا جب وہ کام نہیں کر رہے ہوتے۔ اس کے بعد جب کام کرنا شروع کرتے تو بس کرتے ہی رہتے، ہاں اس بیچ اپنی شریک حیات سعید النساء صاحبہ کو اطلاع دینا ضروری سمجھتے کہ وہ دفتر خیریت سے پہنچ گئے ہیں اور ان کی خیریت لینا اپنا فرض سمجھتے۔ پڑھنے سے تو انھیں عشق تھا اور یہی سب سے بڑی وجہ تھی کہ وہ کسی کی بھی، کوئی بھی بات نکتہ چیں بن کر سیدھے سیدھے کاٹتے نہیں تھے۔ بلکہ اس کے اصل متن کو برقرار رکھتے ہوئے اپنا قلم چلاتے تھے۔ گہرا مطالعہ ان کا شوق بھی تھا اور اصول بھی۔ ان کی میز سے شاید ہی کبھی ایسا ہوا ہو کہ انھوں نے کسی ایک چھوٹے سے کاغذ کے پرزے کو بغیر پڑھے رکھا ہو۔ کونسل کا ماہانہ رسالہ اردو دنیا اور سہ ماہی فکر و تحقیق جس کی ہر ایک سطر ان کی نگاہ کے بغیر نہیں ترتیب دی جاتی تھی۔ بلکہ ہر ایک الفاظ پر ان کی نظر ہوتی۔ وہ خود میں ایک چلتا پھرتا انسائیکلو پیڈیا تھے۔ اردو ادب میں وہ نہ صرف اپنی ذہانت، شاعری، ترجمہ اور صحافت کا لوہا منوا چکے تھے بلکہ اپنی ایمانداری، سادگی اور شائستہ گفتگو سے لوگوں کے دلوں میں ایک خاص مقام حاصل کر چکے تھے۔ مجھے کوئی بھی ایک ایسا موقع یاد نہیں جب وہ غصہ ہوئے ہوں۔ ضبط انتہا تک تھا جس نے انھیں فولادی بنا دیا۔ شاید ہی کبھی کسی کے لیے اپنی زبان سے کچھ برا کہا ہو۔ یہاں تک کہ جب اپنے ضمن میں بھی کچھ سننے کو ملا تو ایسے ہو جاتے جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ اتنی Composed شخصیت کے مالک تھے کہ نہ تو خوشی میں بکھرتے نہ غصے میں بپھرتے، نہ ہی فوراً کسی کے لیے کوئی رائے قائم کرتے، نہ کسی سے کوئی بدلہ لینے کی خواہش، نہ اپنی علمی بصیرت کا غرور، نہ سامنے والے کو کمتر سمجھنا، نہ اپنے وقار سے گر کے کوئی جملہ کہنا، نہ طنز کرنا، نہ برائی میں شامل ہونا، نہ غلط کاموں میں دوسروں کا ساتھ دینا، ہاں جب کوئی بات دل کو گوارہ نہ ہوتی تو خاموشی اختیار کر لیتے اور کنارہ کشی کی کوئی بہتر صورت تلاش کرتے۔ ایک بہت اہم بات جو ان کے قریبی، ان کو جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ وہ شخصیت تھی کہ جو ایک پچھلی صدی کا نمائندہ تھا جو ایک نئے عہد کو بھی جی رہا تھا اور آنے والے کل میں بھی کامیاب زندگی جینے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ یعنی کہ وہ اپنے تینوں زمانوں ماضی، حال، مستقبل کے خود ہی نمائندہ تھے۔ زمانوں کے بدلنے کے ساتھ ساتھ انھوں نے خود کو خود ہی modify کیا۔ لیکن جوان کا اپنا آپ تھا اس کو کسی زمانے کی ہوا نہ لگ سکی۔ یہ بے حد خوبصورت بات ہے کہ ان کے اندر کا انسان، ان کی روح اتنی پاک تھی، انھوں

نے خود کو اتنی خوبصورتی سے بچا رکھا تھا کہ کسی کو اندازہ ہی نہیں ہو پاتا۔ خود کو کہیں کھونا گوارا نہ کیا۔ خود ان ہی کے الفاظ میں کچھ یوں کہتے ہیں کہ:

حسرتوں کی پردہ پوشی سیکھ لو مخمور سے
اس ہنر میں تو زمانہ اس کا قائل ہے یہاں

اس بار اپنی 74ویں سالگرہ یہیں کونسل کے مجلس ادارت کے کمرے میں ہی خاموشی سے منائی۔ میں نے بہت شور کیا۔ تو مٹھائی منگوا کر پورے دفتر میں بانٹ دی، وہ خوشیاں بانٹنے اور اپنے غم خود اپنے ہی تک محدود رکھنے کے قائل تھے۔ جانے کتنے ان کہے درد تھے جو وہ اپنے سینے میں چھپا کر اپنے ساتھ ہی لے گئے۔ فروری کی ابتدا سے ہی طبیعت خراب ہونی شروع ہوگئی تھی۔ لیکن ان کی کام سے لگن کی یہ انتہا تھی کہ وہ اپنی آخری کوشش تک، جب تک ان میں طاقت رہی وہ دفتر آتے رہے۔ اپنی بیماری کا تذکرہ عام طور پر نہیں کیا کرتے تھے۔ اس بار بھی سینے میں جکڑن کی شکایت کرتے رہے، پھر چکنا کھانا بھی کم کردیا۔ بہت دن پرہیز کے طور پر دلیہ پر اکتفا کیا۔ موت کا نہ تو کبھی کوئی ذکر کیا نہ کبھی آنکھوں میں کوئی خوف، ہاں یہ ضرور تھا کہ بہت کچھ کرنا ہے مجھے کہنے لگے تھے کہ وقت نکال کر اب کچھ اپنے کام بھی کروں گا تب میں چھوٹے بچوں کی طرح کہتی کہ سر جب بھی کریں مجھے اسسٹنٹ کی طرح ساتھ رکھ لیجیے گا۔ تو کہتے تم اسسٹنٹ نہیں بیٹی ہو میری۔ ان میں ایک اچھے والد کے تمام اوصاف موجود تھے۔

جب ان کا ہنسنے کا دل چاہتا تو اردو والوں کے ذریعے کی گئی املا کی غلطیوں کو دیکھتے اور خوب کھل کر ہنستے یا پھر اپنے پرانے دنوں کے قصے سناتے تو بھی بہت لطف اندوز ہوتے۔

جیسے جیسے موت قریب آ رہی تھی ان کے چہرے کا نور بڑھتا جا رہا تھا۔

18 فروری دفتر آخری بار آئے، چھوٹے میاں بھی ساتھ تھے۔ چہرے پر نقاہت صاف نمایاں تھی۔ لیکن بہت شفاف دکھائی دے رہے تھے۔ چہرے کی سرخی کچھ ماند تو تھی لیکن ختم نہیں ہوئی تھی جتنی دیر بیٹھ سکتے تھے، اردو دنیا کا جائزہ لیا، وہ ان کی آخری تسلی تھی۔

ایک بجلی سی گری اور کوند گئی، ان کے چاہنے والوں پر سکتے کا سہ عالم تھا۔ ہر طرف صف ماتم بچھی ہوئی تھی۔ کسی کو یقین نہیں آیا، کیونکہ ہر کوئی جو ان سے پچھلے دنوں ملا تھا اس سے انھوں نے یہ ہی کہا تھا کہ پھر ملیں گے۔ فون پر جس نے انھیں سنا ''تو یہ ہی سنا کہ جلد ملیں گے۔'' 'ہاں' جو ان کی مثبت شخصیت کا خاصہ تھا۔ وہ اس طرح 'نا' کہہ کر چلیں جائیں گے یہ وہم وگمان میں بھی نہ تھا۔

مخمور صاحب کے فون کی گھنٹی بج رہی ہے بج رہی ہے، مسلسل بج رہی ہے دل نے چاہا کہ بس ایک بار وہ فون اٹھالیں، وہ شفیق مہربان، لہجہ پھر سنائی دے جائے لیکن ایسا نہ ہوا فون پر دوسری جانب جو آواز ابھری وہ سعیدالنسا آنٹی کی تھی۔ انھوں نے کہا کہ تمھارے سر اب آرام سے لیٹے ہوئے ہیں اور اپنی آخری منزل کی جانب گامزن ہیں۔ میں، چھوٹے میاں اور مخمور صاحب جے پورے سے ٹونک جا رہے ہیں۔ ٹونک ان کا آبائی وطن جہاں 3 مارچ کو انھیں موتی باغ میں واقع شاہی قبرستان میں انھیں ان کے والد کے مزار کے پہلو میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ ان کی جانے سے ایک پچھلی صدی کا ایک باب ختم ہوگیا۔

ان کی کرسی پر بچھی تولیہ کو بدلنے والا جب آیا تو میں نے کہا کہ اب اس کو بدلنے کی کیا ضرورت ہے۔ ان کی خالی کرسی اردو ادب میں ہمیشہ خالی ہی رہے گی اور جو دلوں میں خلا پیدا ہوا ہے وہ کبھی پر نہ ہو سکے گا۔ اللہ انھیں جنت الفردوس میں جگہ دے۔ آمین!

صبح تو نغمہ برلب ہے مگر اے ڈوبتی رات
میرے حصے میں تیری مرثیہ خوانی آئی

□□□

جدید — ہندی اردو لغت (دو جلدوں میں)

مرتب: پروفیسر نصیر احمد خاں

ٹیکنک اور ترتیب وتقسیم کے اعتبار سے ''جدید — ہندی اردو لغت'' اپنی نوعیت کی واحد لغت ہے جس میں قدیم وجدید ہندی کے الفاظ، ان کے تلفظات، مآخذ اور نحوی زمروں کے علاوہ معنی ومفہوم کو اردو اور دیوناگری دونوں رسم الخطوں میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ ماہر لسانیات پروفیسر نصیر احمد خاں کی مرتب کردہ یہ لغت ایک مفید، کارآمد اور سنجیدہ کاوش ہے جو اردو اور ہندی کے طلبہ کی بیشتر ضرورتوں کو پورا کرتی ہے۔

صفحات: 3286 (دونوں جلدیں)، قیمت -/1640 روپے (دونوں جلدیں)

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دھلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب %45 اور %40 کی خصوصی رعایت دی جاتی ھے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ھے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

نصرت ظہیر

مخمور بھائی... آپ سن رہے ہیں؟

زندگی کے تو بہت سے مصرعے ہوتے ہیں لیکن موت کا ایک ہی مصرعہ سب سے زیادہ مشہور ہے: موت اس کی ہے کرے جس کا زمانہ افسوس!

اردو کے منفرد ادیب، شاعر اور نقاد مخمور سعیدی کی موت پر جس طرح ایک زمانہ اظہارِ افسوس کر رہا ہے اسے دیکھ کر ماننا ہی پڑتا ہے ... ہاں مخمور بھائی... واقعی آپ اس دنیا میں نہیں رہے۔

اخبارات میں تعزیتی بیانات کا لامتناہی سلسلہ، ملک بھر میں تعزیتی نشستوں کا انعقاد، ادبی حلقوں میں آپ کی خوبیوں کے تذکرے، مداحوں کے تحریر کردہ تاثراتی مضامین... دل تو نہیں مانتا لیکن پوری اردو دنیا تسلیم کرانے پر تلی ہوئی ہے... وہ خوبرو، وہ سیم تن، وہ سرو قد، وہ حسین چہرہ... اور وہ شہزادۂ اردو ہمارے بیچ سے اٹھ گیا ہے... ہمیشہ کے لیے۔

کتنے اچھے تھے آپ۔ کتنا اچھا لگتا تھا آپ سے مل کر۔ اب بھی جیسے نگاہوں میں آ رہے ہیں، اور جا رہے ہیں۔ کوئی جلسہ ہے، کوئی مشاعرہ ہے، کوئی سیمینار ہے... اور آپ مائک پر ہیں۔ لوگ آپ کو سن رہے ہیں، سمجھ رہے ہیں اور اس سے کہیں زیادہ دیکھ رہے ہیں۔ نفیس، شائستہ، نرم گفتار و خوش کردار، اردو مزاج کی مجسم تعبیر۔ لباس سے بھی، جسم سے بھی، خیالات سے بھی۔

لوگوں کو... خاص طور سے اردو کے ادیبوں کو عمر کیا سے کیا بنا دیتی ہے۔ پچاس ساٹھ برس کے ہوئے نہیں کہ بالکل کارٹون لگنے لگتے ہیں۔ گنجے ہوں تو ٹوپی میں سر چھپانا پڑتا ہے۔ سفید بال ہوں تو ہر ہفتے دل کی سیاہی میں خضاب ملانے کی مجبوری گھیر لیتی ہے۔ آپ کے صرف بال سفید ہوئے۔ خون سرخ ہی رہا۔

انبالے کا وہ مشاعرہ مجھے آج بھی یاد ہے جس میں آپ کو اور شاذ تمکنت کو پہلی بار دیکھا تھا اور مخدوم محی الدین کے فرزند نصرت محی الدین جو عمر میں مجھ سے تھوڑے ہی بڑے رہے ہوں گے، اپنی زندگی کا دوسرا یا تیسرا مشاعرہ پڑھنے آئے تھے۔ آپ اسٹیج پر کسی حسین شاعرہ کے ساتھ بیٹھے تھے اور اس کے نسوانی حسن پر آپ کی مردانہ وجاہت کا غلبہ صاف محسوس کیا جا سکتا تھا۔ اس وقت آپ کے بال کالے تھے۔ پھر رفتہ رفتہ ان میں مہندی کی گلابی سرخی چمکتی رہی... اور بعد کے دنوں میں بالکل سفید رہنے لگے، لیکن آپ کے حسن میں کوئی کمی نہیں آئی۔ بڑھاپا لوگوں کی شکل اور عقل دونوں بگاڑ دیتا ہے، لیکن آپ کو اس نے اور حسین بنا دیا تھا۔ ایسے چمتکار کہاں دیکھنے کو ملتے ہیں؟

لوگ کہہ رہے ہیں آپ ایک بڑے ادیب تھے۔ لیکن آپ کو تو کبھی کسی دوسرے، بڑے یا چھوٹے ادیب کے خلاف سازشیں کرتے نہیں پایا گیا۔ پھر آپ کیسے بڑے ادیب ہو گئے؟ ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر آپ ہی ایمانداری سے بتایئے، جب تک کوئی اردو ادیب دوسرے ادیبوں کے خلاف سازشیں نہ کرے، انھیں نیچا دکھانے کی نت نئی ترکیبیں استعمال میں نہ لائے، ان کے خلاف طرح طرح کے الزام نہ لگوائے، مضمون نہ لکھوائے، ادبی محاذ آرائی نہ کرے، ان کی تخلیقات و تصنیفات میں سرقے نہ تلاش کروائے... تب تک وہ بڑا ادیب کیسے بن سکتا ہے۔ ان میں سے ایک بھی نیک کام آپ نے انجام نہیں دیا۔ اس کے برعکس دنیا نے دیکھا آپ ہر چھوٹے اور جونیئر ادیب کی خوبیاں گنوا رہے ہیں۔ ہمہ وقت ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچتے رہنے والے ادبی گروپ بڑھ چڑھ کر آپ کو اپنے مشاعروں، سیمیناروں اور ادبی جلسوں میں مدعو کر رہے ہیں... اور اس کے باوجود کر رہے ہیں کہ دونوں آپ کو دوسرے گروپ کا آدمی سمجھتے ہیں۔ اس طرح کی ادبی دنیا کس منہ سے آپ کو ایک بڑا ادیب قرار دے رہی ہے، یہ سمجھنے سے میں قاصر ہوں۔ میں تو آپ کو ایک اچھا اور سچا ادیب مانتا ہوں جو عام طور پر کوئی بڑا ادیب نہیں ہوتا۔

لوگ یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ آپ ایک عظیم شاعر تھے۔ معاف کیجیے، مجھے اس میں بھی شک ہے۔ بلکہ خدا معاف کرے، مجھے تو کبھی کبھی آپ کے شاعر ہونے پر بھی شبہ ہوا ہے۔ وہ اس لیے کہ نجی محفلوں میں آپ کو میں نے کبھی اپنے شعر سناتے ہوئے نہیں دیکھا۔ جب بھی سنائے دوسروں کے شعر سنائے۔ بھلا اردو شاعر اور ہر وقت، موقع بے موقع، خود اپنے شعر سنانے کو بے تاب نظر نہ آئے؟ رہ گئی عظیم شاعر ہونے کی بات تو اس میں تامل مجھے اس لیے رہا کہ فی زمانہ عظیم شاعر اسے مانا جاتا ہے جو مشاعرے لوٹ سکے، جو مائک پر آئے تو یوں لگے جیسے کوئی باکسر فائٹ کے لیے آیا ہے۔ چیخ چنگھاڑ کر سامعین کو جھنجھوڑ اور شعر کو بھنبھوڑ رہا ہے، یا پھر ترنم کے نام پر لمبی لمبی تانیں الاپ رہا ہے، عزیزوں، رشتے داروں والے شعر سنا رہا ہے، خصوصی توجہ چاہتے ہوئے سامعین کو داد دینے کے لیے بھڑکا رہا ہے، اکسا رہا ہے، اپیل کر رہا ہے، ہاتھ جوڑ رہا ہے اور لجاجت کی تصویر بنا اس طرح کھڑا ہوا ہے گویا کہہ رہا ہو کہ مٹھی بھر واہ واہ کا سوال ہے بابا، جو دے اس کا بھی بھلا جو نہ دے اس کا بھی بھلا...

آپ مشاعرے میں مائک پر آتے تھے شریفانہ اور مہذب انداز میں، تحت اللفظ سے شعر سناتے تھے اور پھر اسی تہذیب و شائستگی سے آپ کے

شعروں کو سراہا جاتا تھا۔ آپ کے اسٹیج پر آنے سے مشاعرے میں بھونچال نہیں آتا تھا۔ پُرشور فلک شگافی نہیں ہوتی تھی۔ ادبی شعور رکھنے والے سامعین آپ کے شعروں پر داد دیتے تھے اور دل سے داد دیتے تھے۔ آپ ایک مہذب، شائستہ، حساس، پُرگو، قادرالکلام، نکتہ رس، صائب النظر اور شریف شاعر تو ہو سکتے تھے، بلکہ واقعتاً تھے، مگر عظیم شاعر... معاف کریں، مجھے اب بھی تامل ہے... اور پھر آپ شاعری میں کسی مخصوص نظریے کے پرچارک بھی تو نہیں تھے۔ نہ آپ کے یہاں ترقی پسندوں کا عیب مانی جانے والی نعرے بازی تھی، نہ جدیدیوں والی بے سروپا علامت نگاری اور گنجلک و ناقابل فہم بیان بازی۔ ان میں سے کسی ایک طرف بھی ہوتے تو میں مان لیتا کہ آپ ایک عظیم شاعر تھے۔ ویسے بھی عظیم کا یہ لفظ اب اتنا زیادہ استعمال ہونے لگا ہے کہ اس لفظ میں عظیم بہت کم باقی رہ گیا ہے۔ لوگ کسی کو بھی خوش کرنے کے لیے اس کے نام کے ساتھ عظیم یا اعظم جوڑ دیتے ہیں۔ عظیم رہنما، عظیم سادھو اور عظیم مفکر تو ہیں ہی قائد اعظم، برِ اعظم اور بحرِ اعظم بھی کم نہیں۔ اردو قوم پہلے ہی چاروں طرف سے اتنے اعظموں اور اتنے عظیموں سے گھری ہوئی ہے کہ ایک اور عظیم پیدا ہونے کے خیال سے دم گھٹنے لگتا ہے۔

خیر... مخمور صاحب... آپ وفات پاچکے ہیں یہ اطلاع جس روز ملی تھی تب سے اب تک باوجود اتنا بہت کچھ آپ کے بارے میں اخبارات میں پڑھنے اور جلسوں میں سننے کے، دل نہیں مانتا کہ آپ ہمارے بیچ سے جاچکے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ ابھی میں کوئی مضمون لکھوں گا، یا کتاب پڑھوں گا تو فارسی کا کوئی مشکل لفظ یا شعر مجھے الجھن میں ڈال دے گا، جتنی لغات میرے پاس ہیں وہ کام نہیں آئیں گی، مجبوراً آپ کو فون کروں گا، ادھر سے آپ دوستانہ شفقت کے ساتھ پوچھیں گے، کہو میاں کیسے ہو... اور میری الجھن دور ہوجائے گی۔

لیکن، اس روز غالب انسٹی ٹیوٹ کے تعزیتی جلسے میں عزیز برنی نے جو کچھ کہا اسے پڑھ کر دل بھر آیا۔

''... کبھی ایسا وقت آتا ہے جب انسان کو ایک خالی پن سا محسوس ہوتا ہے، یہ وہی وقت ہے...''

عزیز بھائی کا یہ جملہ پڑھنے کے بعد مجھے یہ خالی پن کیوں محسوس ہو رہا ہے؟ دل اتنا بوجھل کس لیے ہے... آپ سن رہے ہیں مخمور بھائی؟...

(بشکریہ ''راشٹریہ سہارا'' 7 مارچ، دہلی)

□□□

وضاحتی کتابیات (22 جلدوں میں)

مرتب: مظفر حنفی

پروفیسر مظفر حنفی نے قومی اردو کونسل کے ایک منصوبے کے تحت سال بہ سال شائع ہونے والی کتابوں کے تعارف اور مختصر تبصرے پر مبنی ''وضاحتی کتابیات'' کل 22 جلدوں میں مرتب کی ہے۔ ہر برس کی کتابوں کا ذکر الگ الگ جلدوں میں ہے۔ موصوف نے وضاحتی کتابیات کے متعینہ اصولوں پر کاربند رہتے ہوئے کم سے کم الفاظ میں متعلقہ کتاب کے بارے میں معروضیت کے ساتھ ضروری اطلاعات فراہم کردی ہیں، جن کے وسیلے سے محقق اور طالب علم مطلوبہ معلومات حاصل کرسکتے ہیں۔

22 جلدوں کی مجموعی قیمت:-/2693 روپے

غزل اور غزل کی تعلیم

مصنف: اختر انصاری

اختر انصاری کی یہ کتاب غزل کی تعلیم کے دوران پیش آنے والے مسائل سے بحث کرتی ہے جس میں اردو غزل کے تاریخی و ادبی پس منظر پر روشنی ڈالتے ہوئے اردو غزل کی ہیئت و مقبولیت، اس کے فنی محاسن، غزل کی تنقید اور بتدریج ارتقائی سفر کا احاطہ کیا گیا ہے۔ یہ کتاب بہ طور خاص درس و تدریس سے وابستہ افراد کے لیے اہمیت کی حامل ہے۔

صفحات: 231، قیمت-/66 روپے

حامدی کاشمیری

اقبال کی نوائے شوق

''بال جبریل'' کی پہلی غزل کا پہلا مصرع ہے:

میری نوائے شوق سے شور حریم ذات میں

یہ نوائے شوق کیا ہے؟ کیا اسے ''بال جبریل'' کے حوالے سے اقبال کی ایک نئی تخلیقی جست سے منسوب کیا جاسکتا ہے؟ اس نوائے شوق کی اصل، ماہیت اور انفرادیت کی نشان دہی کیوں کر ہوسکتی ہے؟

یہ مسلم ہے کہ اقبال حرکت کے شاعر ہیں، ان کی حرکت کے فلسفے کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے، اور ان کے کلام سے وافر مثالیں بھی دی گئی ہیں۔ اس ضمن میں ان کے ''شوق'' (جسے وہ عشق بھی کہتے ہیں) کی اصطلاح کی متعدد تعبیریں بھی کی گئی ہیں۔ مجموعی طور پر ان کے یہاں ''شوق'' کو ان کی مقصدیت یا نصب العینیت کے ستارے کے طور پر سمجھا گیا ہے۔ ان کی مقصدیت کیا ہے؟ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ موجودہ مادی اور کاروباری دور میں جب کہ انسان صدیوں کی ذی احترام قدروں سے بے گانہ ہو رہا ہے، انسان اخلاقی صلاح یابی (Moral Regeneration)، ذہنی آزادی، آبرومندی اور روحانی سکون کے ساتھ زندگی گزار سکے۔ اقبال کے نزدیک یہ جب ہی ممکن ہے جب انسان خود شناسی کے عمل سے گزرے تاکہ وہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے انفرادی اور اجتماعی طور پر ایک متوازن اور بابرکت زندگی گزارے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے وہ انسان کے لیے متحرک ہونا لازمی سمجھتے ہیں، اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک انسان کے دل میں آتش شوق روشن نہ ہو۔

''شوق'' کی اس مقصدی تعبیر و تشریح سے کوئی اختلاف نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ اس کے زوال کے جو بھی خارجی، سیاسی اور سماجی محرکات پیش کیے گئے ہیں، یعنی انسان کی مادہ پرستی، اس کی روحانی اوصاف سے بے گانگی، اسلامی اقدار سے روگردانی اور انسانی منصب کی بے توقیری، یہ سب اپنی جگہ پر درست سہی، تاہم ایک بنیادی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ''زوالِ آدمِ خاکی'' کی موجودہ عبرت ناک صورت حال کی تردّد انگیز اور آفاق گیر آگہی اقبال ہی کے حصے میں کیوں کر آئی؟ اور وہ تن تنہا پوری سنجیدگی سے پورے عہد سے نبرد آزما ہونے پر تیار کیوں کر ہوئے؟

اس سوال کا جواب محض یہ کہہ کر نہیں دیا جاسکتا کہ اقبال اس عہد کے واحد ''دیدہ ور'' اور ''دردمند'' بڑے شاعر ہیں۔ یہ کہنا کافی نہیں ہے کہ وہ تاریخ کے نکتہ سنج طالب عالم رہے ہیں، شوکت پاستان سے ان کی دلی وابستگی رہی ہے، انسان دوستی ان کا مسلک رہا ہے، یا اپنے ہم وطنوں کی محکومی سے وہ متردد رہے ہیں۔ بے شک ان کو ایک غیر معمولی صورت حال سے گزرنا پڑا تھا، لیکن یہ صورت حال چالیس کروڑ ہندوستانیوں میں مشترک تھی۔ بجا کہ ہر ہندوستانی ان کی طرح بابصیرت نہ تھا کہ اس صورت حال کے مضمرات کو تمام و کمال سمجھ لیتا، لیکن حالت تو بہرحال سب پر ایک ہی سی مستولی تھی۔ انھوں نے ''تشکیل جدید'' میں خود لکھا ہے کہ ''وہ (انسان) اپنے ضمیر اور باطن سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے۔'' اس طرح ہمارا سامنا ایک ایسے مفکر شاعر سے ہوتا ہے جو معاصر بحرانی عہد کے پورے آشوب کو اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے۔ وہ استحصالی اور غاصب قوتوں کو زیر کرنے کی تلقین کرتا ہے، وہ اس پر بس نہیں کرتا، بلکہ ''خلاقِ جہانِ تازہ'' ہونے پر اصرار کرتا ہے:

خیز و خلاقِ جہانِ تازہ شو
شعلہ در برکن، خلیل آوازہ شو

یہ وہ کام ہے جو کوئی دوسرا نہ کرسکا۔ ان کی ''آتش نوائی'' میں بے شک بعض خارجی محرکات کام کرتے ہیں۔ لیکن ان کے بنیادی محرک کا سراغ تو اور کہیں نہیں صرف ان کے باطن ہی میں لگایا جاسکتا ہے

پھونک ڈالا ہے میری آتش نوائی نے مجھے
اور میری زندگانی کا یہی ساماں بھی ہے

اقبال کی بیشتر شاعری ان کی باطن شناسی ہی کے عمل کی مظہر ہے، ان کے پورے فلسفۂ خودی کا محور یہی باطن شناسی ہے۔ باطن شناسی کی یہ ترغیب اتنا تیقن اور پُر زور عمل ہے کہ ان کی شاعری ان کے باطن کا شناخت نامہ بن جاتی ہے۔ اس طرح اس عصری شعور کو مفرق کرنا ممکن ہوگیا ہے، جو اقبال کے معاصرین جوش کے یہاں ملتا ہے جوش اپنے عصری شعور کو بروئے کار لاکر بلند آہنگی کے ساتھ کے سیاسی مسائل مثلاً کشمکش حصولِ آزادی کی نغمہ خوانی کرتے ہیں۔ ظاہر ہے اس طرح ان کا عصری شعور محض ایک ذہنی عمل ہو کے رہ جاتا ہے، جب کہ اقبال کے یہاں عصری شعور شخصیت کی کلیت میں حل ہوکر ایک آفاقی شعور میں ڈھل جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے عصر کو ''دانندۂ اسرار'' قرار نہیں دیتے ہیں۔ وہ تاریکی عصر کی حد بندیوں کو توڑ کر عالمی صورت حال پر محیط ہوجاتے ہیں۔

یہ معجزاتی عمل اقبال کے لیے یوں ممکن ہوا کہ وہ اپنے وسیع تر فکری تناظر کے بل بوتے پر اس کائناتی شعور پر حاوی ہوگئے، جس پر متصرف ہونے کے لیے سائنس، فلسفہ اور تصوف کوشاں رہے ہیں، تاہم جو اپنی کلی صورت میں کسی نابغۂ روزگار شاعر ہی کے حصے میں آتا ہے۔ یہ آگہی جتنی شعوری ہے اس سے کہیں زیادہ لاشعوری ہے۔ اقبال نے یورپ میں فکر و فلسفہ کا بالاستیعاب مطالعہ کیا۔ اور

پھر بیسویں صدی کے آغاز میں جب کہ جنگ عظیم کے گہرے سائے منڈلا رہے تھے، انھوں نے مغربی سیاست، تجارت اور استحصال، ملک گیری اور نوآبادیاتی جبر کے ہوش رُبا مناظر دیکھے۔ طبعاً وہ مفکر تھے، ان کی شعری سرشت بھی رفتہ رفتہ ان کے تفکر میں رچ بس گئی۔ وہ مشرق اور مغرب کے حوالے سے انسانی آشوب کا جائزہ لیتے رہے۔ ان کی خوش اقبالی یہ ہے کہ وہ محض علم وخبر یا اخذ واکتساب پر قانع نہ رہے، بلکہ کارزارِ خیر وشر میں انسان کے منصب اور کارگزاری کو وہ خود پر وجدانی طور پر منکشف اور متعین کرنے میں کامیاب ہوئے۔

یہ خارج سے باطن کی طرف مراجعت کا رویہ ہے، یہ اپنے من میں ڈوب کر سراغ زندگی پانے کا راستہ ہے، یہ خودی کے اسرار کی پردہ کشائی کا عمل ہے۔ چنانچہ ان کا مفکرانہ، متجسسانہ اور مستفسرانہ رویہ ان کو کائنات، خالق کائنات اور انسان کے مابین رشتوں کی آگہی کے قریب لے گیا، اور اس پیچیدہ صورت حال میں انسان کے لائحہ عمل کی تشکیلیت کے شعور سے متصف کر گیا۔ یہ محض دردِ ملت یا درد انسان کا ورد کرنے سے ممکن نہ تھا۔ دردِ ملت یا دردِ انسان، یہاں تک کہ انقلابیت، کو حرزِ جاں بنانے والوں کی ہمارے یہاں ان دنوں کوئی کمی نہ تھی، لیکن ان میں سے کوئی اقبال کی سطح پر نہ آسکا۔ اقبال نے تخلیقی فن کی جس قوت کے ساتھ پوری صورت حال کا سامنا کیا، وہ انھیں کا حصہ تھا۔ ان ہی نے انسان کو مابعد الطبیعیاتی سطح پر کائناتی پس منظر میں اپنے مقام ومنصب سے آگاہ ہونے پر زور دیا، اتنا ہی نہیں بلکہ معاشرتی سطح پر اسے محکومی اور پسماندگی کے دلدل سے نکلنے کے لیے جو راہ نجات دکھائی وہ ان ہی سے ممکن تھی۔

اقبال نے دراصل حیات وکائنات کی اصل پر غور وفکر کرتے ہوئے بعض ازلی حقیقتوں تک رسائی حاصل کرلی تھی۔ انھوں نے، جیسا کہ ان کے خطبات سے ظاہر ہے، کائنات کی آفرینش کا راز دریافت کرنے کی سعی کی اور اس سلسلے میں سائنس، مغربی اور مسلم مفکرین اور متصوفانہ روایت نے جو پیش رفت کی ہے، اس پر بھی نظر رکھی۔ انسان کی تخصیص یہ ہے کہ وہ آگہی کی منزل پر کائناتی اسرار کو بے نقاب کرنے کی اس ازلی خواہش سے دوچار ہے جسے اقبال ''شوق'' کہتے ہیں۔ انسان کا دماغ ٹھوس مادی اصل کے باوجود اپنی ساخت اور خارج سے ٹکرانے کے ردعمل کے نتیجے میں غیر معمولی آگہی کو خلق کرنے پر قادر ہے۔ یہ ذہنی آگہی اپنی شدید صورت میں آگہی کی آگہی میں بدل جاتی ہے۔ یہ ذہنی عمل خارجی کائنات کے حقائق ومظاہر پر غور وفکر کرنے کی ترغیب دینے کے ساتھ ساتھ وجود کے توسط سے عرفان ذات یعنی Know thyself کی طرف بھی لے جاتی ہے۔ یہ ذہنی عمل فنکار کے یہاں تخلیقی توانائی کی شناخت اور اس کی اظہار طلبی کے رموز سے آگہی کے مترادف ہوجاتا ہے۔ فن کار کائناتی اسرار کے انکشاف کے لیے اپنے وجود سے رابطہ قائم کرتا ہے، اس لیے کہ اس کا وجود بھی کائنات کا ہی ایک ناگزیر حصہ ہے۔ وہ خود کو خود پر منکشف کرنے کے بے پناہ جذبے سے دوچار ہوتا ہے۔ خود اس کی کائنات بھی اکتشاف طلبی کے عمل سے گزرتی ہے، اس طرح سے عرفانیت کی معروضی بنیاد فراہم ہوتی ہے۔

کائنات کے بعض حقائق زمان ومکان کے بارے میں سائنس، فلسفہ اور دیگر علوم نے اپنی اپنی توجیہات وتفاسیر پیش کی ہیں۔ جدید سائنس نے ایک قدم آگے بڑھ کر زماں کو ایک ابدی بہاؤ کی صورت میں دیکھا ہے، تاہم اس کا سہرا صرف سائنس کے سر نہیں جاتا، بلکہ مغربی اور مسلم فلسفیوں نے بھی اس سلسلے میں خاصا کام کیا ہے، سائنس مرورِ زماں کے نظریے پر زور دینے کے باوجود زماں کے معرض وجود میں آنے، اس کے مقصد اور آغاز وانجام اور اس کے خالق کے بارے میں کچھ نہیں کہتی۔ یہی صورت دیگر علمی وفکری شعبوں کی بھی ہے۔ مذہب کا تاہم یہ استدلال کہ اس عظیم کائناتی وقوعے کو محض اتفاق یا حادثہ پر محمول نہیں کیا جاسکتا، بلکہ اس کے پس پردہ کسی عظیم ترین منتظم کا دستِ غیب کام کرتا ہے، ناقابل تردید ہے۔

اقبالیاتی فکر کے ضمن میں بنیادی اہمیت اس بات کو حاصل ہے کہ کائنات یا اس کے مظاہر یعنی زماں ومکاں دراصل ایک لامتناہی تحریک پذیر اور عدیم النظیر انرجی کا اظہار ہے، جو مسلسل حرکیت سے قابل شناخت ہوتی ہے۔ یہ حرکیت مختلف مظاہر وموجودات کی طرح امکانی صورت میں انسان سے بھی مخصوص ہے۔ انسان بے کراں کائنات میں زمین جیسے معمولی سیارے پر سانس لینے کے باوجود اپنی فطری خصوصیت کی بنا پر کائنات سے اپنے رشتے کی اسراری نوعیت کو بے نقاب کرنے کا بے پناہ جذبہ رکھتا ہے۔ انسان کا یہ جذبہ اس توانائی کا پیدا کردہ، جو کائنات کا ایک حصہ ہونے کی بنا پر انسان کو ودیعت ہے۔ کائنات کے مقابلے میں اس کی تخصیص یہ ہے کہ کائنات کا حصہ ہونے کے باوجود اپنے وجود کی آگہی کی بنا پر اشرف المخلوقات کا درجہ رکھتا ہے۔ اس طرح سے اس کے وجود کی انفرادیت اور وقعت قائم ہوجاتی ہے۔ یہ شعورانا ہے، جو کائنات کا خاصہ ہے اور انسان میں مرتکز ہوکر اپنی آزاد تخلیقی حیثیت منواتا ہے۔ یہ وہی بے پایاں قوت ہے، جو کائنات کی شناخت ہے اور برابر توسیع پذیر ہے:

یہ کائنات ابھی نا تمام ہے شاید
کہ آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکون

لازماً انسان کی قوت بھی بڑھتی ہے اور اپنا اظہار چاہتی ہے۔

اقبال کے حرکی تصور کا ایک پہلو یہ ہے کہ انسان کی تخلیقی قوت آزاد فطری ہونے کے باوصف فطرت کے مقابلے میں خود قائم کردہ تہذیب اور تطہیر کے قواعد کا احترام کرتی ہے، اور فطرت کے بے محابا قاہرانہ اظہار سے اپنے آپ کو ممیز کرتی ہے۔ اقبال نے اپنی تخلیقی قوت کے منبع تک رسائی حاصل کی اور پھر انسانی اقدار، تاریخ اور تمدن کے پس منظر میں اس کی ضروری تشکیل کی۔

اقبال کی یہی تخلیقی توانائی شاعری کے حوالے سے ''درد وسوز وآرزومندی'' بن کر ان کی متاع بے بہا ہے۔ انھوں نے اس توانائی کو نہ صرف اپنے

اور منکشف کیا بلکہ اسے اپنے نظریہ حیات کی تجسیم وتشکیل کے لیے بھی برتا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں مقصدیت یا نظریہ محض عقلی نہیں بلکہ شخصیت کی جامعیت کی پیدا کردہ ہے، اور'' نوائے شوق'' میں ڈھل کر جمالیاتی آب وتاب حاصل کرتی ہے۔

اقبال کے باطن میں کائناتی توانائی جلال و جمال کے لازوال سرچشموں میں منتقل ہوگئی ہے۔ مسجد قرطبہ ہو، ساقی نامہ ہو، ذوق وشوق ہو یا'' بال جبریل'' کی غزلیں، جلال و جمال کے ان ہی سرچشموں سے سیراب ہیں۔ ان کے شعری عمل میں ٹھوس اور متین انفرادیت ہے، اور یہ انفرادیت ان کی نگاہ شوق کی دین ہے:

کچھ اور ہی نظر آتا ہے کاروبار جہاں
نگاہ شوق اگر ہو شریک بینائی

یہی وجہ ہے انھوں نے شاعری کے روایتی موضوعات اور اسالیب سے انحراف کیا اور ایک ایسی شعری دنیا کے مالک بن گئے، جو انھوں نے خود پیدا کی

وہی جہاں ہے ترا تو کرے جسے پیدا
یہ سنگ وخشت نہیں جو تری نگاہ میں ہے

روایت سے اپنا سفر شروع کرنے کے باوجود انھوں نے جدت کا راستہ نکالا۔ شروع میں انھوں نے نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی، جیسے عشق کے پیش پا افتادہ مضامین نظم کیے، لیکن'' بانگ درا'' کے ابتدائی دور سے ہی انھیں تلاش، جستجو اور تجسس کا جذبہ و بے اطمینانی اور کرب سے آشنا کرتا رہا۔ وہ فطرت اور انسان کے رشتوں پر استفہامیہ نظر ڈالتے رہے۔ وہ'' رہ نورد شوق'' تھے اور ہر مقام سے آگے کے مقام کی تلاش کرتے رہے۔

یورپ سے لوٹنے پر فکر وفلسفہ کے گہرے مطالعے اور عہد حاضر میں انسانی صورت حال کا سامنا کرنے پر انھیں محسوس ہوا کہ جہد للبقا میں روایتی عشقیہ شاعری یا متصوفانہ شاعری شاید کوئی کرنا نہیں چاہتے تھے۔ ان کے لیے شوق عشق بن گیا اور معجزہ کار ہوگیا

عشق کی تقویم میں عصر رواں کے سوا
اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام
عشق کے مضراب سے نغمۂ تار حیات
عشق سے نور حیات، عشق سے نار حیات
(مسجد قرطبہ)

عقل و دل و نگاہ کا مرشد اولین ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بت کدۂ تصورات
(ذوق وشوق)

شوق کا یہی تصور ان کی مقصدیت بھی ہے اور شعری محرک بھی، اور دونوں کے اتصال سے اس کی انفرادیت مسلم ہوجاتی ہے۔ اس طرح سے ان کی شاعری روایتی عشقیہ شاعری سے الگ ہوجاتی ہے۔ یہ ہنگامی جذبات رشتوں کے بجائے عالم گیر انسانی صورت حال سے مربوط ہوجاتی ہے۔ کلاسیکی شعرا میں شوق انسان کی باطنی قوت کو محیط ہے، جو کائناتی قوت کے مماثل ہے۔

شوق ہے سامان طراز نازش ارباب عجز
ذرہ صحرا دست گاہ و قطرہ دریا آشنا

تاہم غالب کے یہاں انسان کی ازلی قوت کی موجودگی اس کے اثبات و اظہار تک ہی محدود ہے۔ برعکس اس کے اقبال اسے انسانیت کی بہبود اور برکت کے لیے استعمال کرنے کے متمنی نظر آتے ہیں۔ اقبال کے یہاں یہ قوت مقصدیت میں ڈھل کر جمالیاتی ترفع میں بدل جاتی ہے البتہ جن اشعار میں یہ عمل واقع نہیں ہوتا وہاں کلام منظوم وجود میں آتا ہے۔

غور سے دیکھا جائے تو عالمی سطح پر تخلیقی عمل کے پس پشت کائناتی توانائی ہی ہے اور یہی فنون لطیفہ کی صورت میں اس کے بنیادی محرک کا کام کرتی ہے اور یہی اس کا جواز بھی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ مختلف شعرا'' فکر ہر کس بقدر ہمت اوست'' کے مصداق اپنی استعداد، فکر اور بصیرت کے مطابق اس سے مستفیض ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ تخلیقی قوت مختلف شعرا کے یہاں مختلف درجات کی مظہر ہوتی ہے اور یوں پست و بلند کا تعین ہوتا ہے۔ غالب کے یہاں اس نے انا کے ساتھ ساتھ وجودی کرب کی متناقض صورت اختیار کی۔ حسرت موہانی کے یہاں یہ حسن وعشق کی کیفیات میں ڈھل گئی ہے اور فیض کے یہاں یہ معاشرتی کشمکش کے شعور کی تصویر بن گئی ہے۔ جو بھی صورت ہو، یہ تخلیقی قوت ہی ہے جو تخلیق فن میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ عام طور پر شعرا کی تخلیق شعر کے دوران خودرفتگی، استغراق اور محویت سے گزرنا، دراصل شعور کے بجائے لاشعور کی کارفرمائی کو قبول کرنا ہے اور یہ تخلیقی قوت ہی سے رشتہ قائم کرنے کے مترادف ہے۔

آخر میں'' بال جبریل'' کے اس شعر جس کا پہلا مصرع مضمون کے شروع میں عرض کیا گیا، یعنی

میری نوائے شوق سے شور حریم ذات میں
غلغلہ ہائے الاماں بت کدۂ صفات میں

کی قرأت سے شعر کے پہلے لفظ'' میری'' پر قدرے زور ڈالنے سے متکلم اپنی نوائے شوق کی اثر پذیری کو اپنے اور صرف اپنے آپ سے مختص کرتا ہے اور'' مردے خود آگاہ ہے'' ہونے کے دعوے کو تقویت دیتے ہیں۔ نوائے شوق کے حریم ذات میں شور آفرینی انسان کے خلیفۃ الارض ہونے کا اشاریہ ہے۔ یہ اقبال ہی ہیں جو اپنی تخلیقی قوت کی بنا پر حریم ذات میں شور پیدا کرنے اور بت کدۂ صفات یعنی دنیا میں غلغلہ پیدا کرنے کی جسارت کرتے ہیں اور اپنی نوائے شوق کو'' سوز حیات ابدی'' میں بدل دیتے ہیں۔

(ماخوذ ماہنامہ'' شب خون''، فروری-2002) ☐☐☐

انور پاشا

جمہوری اقدار اور ہمارا ادب

جمہوریت کو عموماً ایک طرز حکومت یا سیاسی نظام سے وابستہ کر کے دیکھا جاتا ہے۔ بالخصوص ابراہم لنکن کے ذریعے جمہوریت کی بیان کردہ تعریف جس میں یہ کہا گیا ہے کہ ''جمہوریت ایک ایسی طرز حکومت ہے جو عوام کی، عوام کے لیے، اور عوام کے ذریعے ہوتی ہے۔'' جمہوریت کے اسی خاص تصور پر محیط ہے۔ اس تعریف سے اسی تصور کو تقویت ملتی ہے کہ جمہوریت ایک سیاسی نظام اور طرز حکومت ہے جس میں عوام یعنی اکثریت کو برتری حاصل ہوتی ہے اور اسی کے ذریعے سب کچھ طے کیا جاتا ہے۔ اس میں کوئی دورائے نہیں کہ جمہوریت کا تصور ایک جدید طرز حکومت اور سیاسی نظام سے وابستہ تصور ہے اور جسے عہد جدید کا مقبول ترین نظام حکومت تسلیم کر لیا گیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جمہوریت کا تصور صرف ایک طرز حکومت یا سیاسی نظام تک محدود نہیں یہ بنیادی طور پر ایک طرز فکر اور ایک طرز حیات ہے جس کا محور اجتماعیت ہے اور جس کی روح میں ''جیو اور جینے دو'' کا تصور کارفرما ہے۔ اور اس تصور کا رشتہ روز ازل سے بنی نوع انسان سے مربوط رہا ہے۔

اگر ہم انسانی تاریخ اور عہد بہ عہد اس کے ارتقا کا مطالعہ کریں تو ہمیں یہ اندازہ ہوگا کہ انسان بنیادی طور پر ایک جمہوری ذی روح ہے جو نہ صرف اجتماعیت کے اصولوں پر گامزن رہ کر نامساعد حالات میں بھی اپنی بقا کے لیے فضا ہموار کرتا آیا ہے بلکہ جمہوری طرز حیات کے تصور کو اختیار کر کے ایسی انسانی قدروں کو وضع کرنے پر کاربند رہا ہے جو وسیع تر انسانی مفاد کی ضامن ہوسکیں۔ یہ جمہوری طرز حیات سے وابستہ تصور کی طاقت ہی رہی ہے جس نے ہر عہد میں نامساعد حالات اور انسانیت کش قوتوں سے نبرد آزما ہونے پر اسے آمادہ کرتی آئی ہے۔

دراصل جمہوریت آمریت کی ضد ہے۔ آمریت خواہ ایک فرد واحد کی ہو یا کسی جماعت یا گروہ کی۔ انسانی و جمہوری نقطہ نظر سے ہمیشہ لائق تردید ہی ٹھہرے گی۔ کہا جاتا ہے کہ ماقبل تاریخ دور یعنی Primitive age میں انسان جمہوری و اشتراکی طرز حیات پر ہی کاربند تھا۔ رفتہ رفتہ بعد کو انفرادی طاقت کے ہوس ناک مظاہرے اور غیر جمہوری طرز فکر نے انسان کی سوچ میں کجروی کو اہمیت دے دی۔ جس سے تفریق و امتیاز کی گنجائشیں بڑھتی چلی گئیں اور جمہوری اقدار و طرز حیات پر غیر جمہوری و آمرانہ اقدار کو غلبہ حاصل ہوتا گیا۔ نتیجے میں فرد واحد یا ایک مختصر گروہ یا جماعت کی طاقت کے غلبے نے مختلف شکلوں میں آمریت کو جنم دیا جو بعد کے زمانوں میں ایک مستقل نظام کی شکل میں فروغ پاتی گئی۔

نشاۃ ثانیہ کے بعد یورپ نے کروٹ لی اور سائنسی فکر و تعلیم کی توسیع کے ساتھ ساتھ نئے نظام معیشت کے جلو میں ابھرتے نئے شعور نے جمہوریت کو از سر نو ایک تصور، ایک طرز حکومت اور ایک سیاسی نظام کی شکل میں اس شدومد کے ساتھ اجاگر کیا کہ یہ تصور اور نظام عہد جدید کا بنیادی منشور قرار پایا اور آج عالم یہ ہے کہ جمہوری اقدار و نظام کو عالمی سطح پر ایسی فوقیت حاصل ہے کہ دنیا کا کوئی بھی ملک یا قوم اس نظام اور تصور کو نظرانداز کر کے مہذب ملک و قوم کی فہرست میں شامل نہیں ہوسکتی۔

ادب و تخلیق چونکہ انسان کی بہترین ذہنی اپج سے عبارت ہے۔ یہ فنکار کی فکری و جمالیاتی جوہر کا ایسا اظہار ہے جو قاری کے فکر و جمال اور احساس و ادراک کی تہذیب و تدوین میں معاون ہوتا ہے۔ اس طرح ادب کے دائرہ کار میں انسان و کائنات کے وہ تمام مظاہر شامل ہوجاتے ہیں جن کا تعلق انسان کے فکر و جمال اور احساس و ادراک سے ہے۔ ادیب و فنکار چونکہ فطری طور پر انسانیت اور انسانی اقدار کا علم بردار ہوتا ہے لہٰذا ہر وہ فکر و تصور یا عمل و مظاہر جو انسانی اقدار کے منافی ہوتے ہیں ادیب ان کے خلاف سینہ سپر ہوتا ہے اور مثبت قدروں کی حمایت کو اپنا اولین فریضہ تصور کرتا ہے۔ فنکار کی یہی صداقت پسندی اور حق شناسی اس کے فن کو آبدار بناتی ہے اور عوامی سطح پر اسے مقبول و لازوال کرتی ہے۔ ایک مثبت قدر اور تصور کے طور پر جمہوریت اور جمہوری اقدار چونکہ انسانی اقدار کے عین موافق ہوتی ہیں۔ اس لیے جمہوری و عوامی احساس و ادراک کی ترجمانی و اظہار کو دنیا کے ہر ادب میں فوقیت حاصل رہی ہے۔

اردو ادب میں بھی جمہوری و عوامی اقدار کی ترجمانی کم و بیش ہر دور میں ہوتی آئی ہے۔ ابتدائی دور میں تصوف کے غالب رجحان کے زیر اثر جمہوری انسان دوست اقدار و تصورات کو اردو ادب میں مرکزیت حاصل رہی۔ گرچہ اردو زبان و ادب کے آغاز و ارتقا کا زمانہ ہندوستان میں سیاسی نظام کے اعتبار سے بادشاہت و جاگیردارانہ اقدار و نظام کا زمانہ تھا۔ لیکن اردو چونکہ درباروں اور خواص سے دور بازاروں اور خانقاہوں میں پروان چڑھی۔ لہٰذا اس کے مزاج میں عوامی و جمہوری اقدار اس طرح پیوست ہوگئیں کہ یہ قدریں ہی اس کی اصل شناخت بن گئیں۔ دکن جہاں اردو کو درباروں کی سرپرستی حاصل ہوئی وہاں بھی اردو زبان و ادب کا مزاج بنیادی طور پر عوامی و جمہوری ہی رہا۔ دکن کے ادیبوں اور شعرا کے ذریعے تخلیق کردہ مثنویوں، نظموں اور مرثیوں میں پیش کردہ افکار و تصورات جمہوری و عوامی اقدار سے ہرگز عاری نہیں۔ صوفیائے کرام کے کلام و نثری تحریروں سے لے کر فخر دین نظامی، قلی قطب شاہ، وجہی، غواصی، نصرتی، ہاشمی، ولی اور سراج کے یہاں ایسے افکار و تصورات جابجا موجود

ہیں جنھیں جمہوری و عوامی افکار و تصورات کے زمرے میں رکھا جاسکتا ہے۔

شمالی ہند میں اردو کے ابتدائی دور کو خسرو اور پھر بعد ازاں اگر کبیر کے حوالے سے دیکھا جائے تو عوامی و جمہوری اقدار و تصورات کے نمایاں نقوش کو تصوف اور بھگتی کے رنگوں کے حوالے سے محسوس کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اگر اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے تناظر میں شمالی ہند کے ادبی و شعری سرمائے پر نظر ڈالیں تو جاگیردارانہ اقدار کے غلبے کے باوجود اس عہد کے شعر و ادب میں عصری نظام کے بکھرتے شیرازے کی گونج اور عوامی اقدار کی آواز صاف سنائی دیتی ہے۔ جعفر زٹلی کی احتجاجی و باغیانہ شاعری ہو یا میر کی مثنویوں، شہر آشوبوں اور غزلوں میں نمایاں افکار و اقدار، سودا کی ہجویات میں پیش کردہ عصری بدحالی اور تباہی کا ذکر ہو یا درد کا دل گیر فکر و احساس ان سب میں زیریں لہر کے طور پر عوامی و جمہوری اقدار کا طرز نمایاں ہے۔ ظاہر ہے کہ جاگیردارانہ اقدار و نظام کے دور میں جمہوری و عوامی افکار و تصورات کے اظہار کی اپنی حدیں بھی تھیں۔ برملا طور پر جمہوری و عوامی اقدار و تصورات کا اظہار اس وقت اس شکل میں ممکن نہ تھا جس شکل میں بعد کو ممکن ہوا۔ لیکن اگر بین السطور موجود افکار کا تجزیہ کیا جائے تو ایسے افکار و تصورات اور اقدار سے اس دور کا ادب بھی ہرگز خالی نہیں۔

سکہ زد برگندم و موٹھ و مٹر
پادشا ہے تسمہ کش فرخ سیر (جعفر زٹلی)

جعفر زٹلی نے اس عہد میں عوام الناس کی بدحالی و خستگی کا نقشہ ایک دوسری نظم میں کچھ یوں کھینچا ہے جس سے اس کے عوامی و جمہوری شعور کا پتہ چلتا ہے۔

ہر صبح ڈھونڈے چاکری
کوئی نہ پوچھے بات ری
سب قوم ڈھووے لاکڑی
یہ نوکری کا خط ہے
گھوڑا رہا بھوکا سدا
درفاقہ شہد و میاں گدا
بی بی کہے میرا خدا
یہ نوکری کا خط ہے

مندرجہ ذیل اشعار میں موجود یاسیت اور الم ناکی کا اظہار صرف شاعر کے ذاتی کرب کا اظہار نہیں بلکہ یہ اس عصری المیے کا مظہر ہے جو اس زمانے کے عوام یا جمہور کی زندگی کا المیہ تھا۔

میر جنگل پڑے ہیں آج یہاں
لوگ کیا کیا یہیں تھے کل بستے
مزاجوں میں یاس آگئی ہے ہماری
نہ مرنے کا غم ہے نہ جینے کی شادی

شام سے ہی بجھا سا رہتا ہے
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا
خاک بھی سر پہ ڈالنے کو نہیں
کس خرابے میں ہم ہوئے آباد
زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

اردو کے پہلے عوامی شاعر نظیر اکبر آبادی کے یہاں تو جمہوری و عوامی اقدار کے جلوے ہر جگہ نمایاں ہیں۔ نظیر وہ پہلے شاعر تھے جن کے یہاں طبقہ جمہور یعنی ہندوستان کے عوامی طبقے کی زندگی کی ترجمانی اور ان کے مسائل کی تصویر کشی کو مرکزیت حاصل ہوئی۔ نظیر اکبر آبادی کی شاعری کی زبان ان کی لفظیات، تشبیہات و استعارات نیز موضوعات و مرکزی خیالات سبھی کچھ عوامی و جمہوری فکر کے مظہر ہیں۔ جاگیردارانہ نظام کی بدحالی و ابتری کے تناظر میں عوامی زندگی کی خستگی کی تصویر کشی جس خوبصورتی کے ساتھ نظیر اکبر آبادی کی شاعری میں ملتی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ''مفلسی''، ''بنجارہ نامہ''، ''روٹی نامہ''، ''ہولی''، ''دیوالی''، ''برسات کی بہاریں'' وغیرہ جیسی نظمیں عوام اور جمہور کے جذبات و احساسات کی عکاسی کے نقطہ نظر سے ہمارے ادب میں کلاسک کا درجہ رکھتی ہیں۔

انیسویں صدی کے سب سے قدآور شاعر غالب کے یہاں بھی عوامی و جمہوری اقدار و احساس کی جھلک خوب خوب ملتی ہے۔ غالب کی شاعری میں بین السطور موجود اضمحلال و بے چینی دراصل اس عہد کی عوامی زندگی کے اضمحلال و اضطراب کی داستان سناتی ہے۔

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا ہے
چپک رہا ہے بدن پہ لہو سے پیراہن
ہماری جیب کو اب حاجت رفو کیا ہے

یا پھر غالب کا یہ کہنا کہ

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار کا اک گھر بنایا چاہیے
کوئی ہم سایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار
اور اگر مرجائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

دراصل اس عصری کرب و اذیت کا اظہار ہے جس کے اسیر نہ صرف غالب تھے بلکہ پورا عصر تھا۔

انیسویں صدی کا دور تغیر و تبدل کے اعتبار سے ہماری تاریخ میں حد درجہ

اہمیت کا حامل رہا ہے۔ انگریزی سامراجیت کے بڑھتے غلبے، 1857 کی بغاوت کی ناکامی، برطانوی حکومت کا مکمل تسلط، ہندوستانی عوام کی شکست خوردگی سے تشکیل شدہ عصری منظرنامہ اگر ایک طرف شکست و ریخت سے عبارت تھا تو دوسری جانب مختلف اصلاحی تحریکات کی شکل میں نئی تشکیل وتعمیر کا اعلامیہ بھی تھا۔ تہذیبی وسماجی اور اصلاحی تحریکات کے جلو میں ادبی سطح پر بھی نئی بیداری کا آغاز ہوا۔ اب درباروں اور امراوخواص کی جگہ عام آدمی اور اس کی زندگی کی ترجمانی ہمارے ادب کا محور قرار پایا۔ محاکے اور اصلاح کا مخاطب طبقہ جمہور بنا۔ ادب تفریح طبع کا ذریعہ بننے کی بجائے بیداری و اصلاح کا وسیلہ بنا، جس کا براہ راست موضوع طبقہ جمہور تھا۔ نتیجہ میں ادب کا فکری ولسانی ہیولی تبدیل ہوا اور جمہوری وعوامی اقدار حیات و معاشرت کی ترجمانی کو ادب کا بنیادی مقصد قرار دیا گیا۔ فکروموضوعات کے ساتھ اصناف کی سطح پر بھی تبدیلیاں در آئیں۔ قصیدہ اور داستان جیسی اصناف کی گنجائشیں ختم ہوگئیں اور ان کی جگہ نظم اور ناول جیسی جدید اصناف کا ورود ہوا۔ جن کا مزاج روز اول سے عوامی و جمہوری رہا۔ محمد حسین آزاد، حالی اور شبلی کی نظمیں اور نذیر احمد، سرشار، شرر اور رسوا کے ناول اور ان میں پیش کردہ موضوعات ومسائل عوامی وجمہوری اقدار کی پیشکش کی واضح مثالیں ہیں۔

بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہندوستان میں عوامی سطح پر بیداری کی ایک نئی لہر کا بھی آغاز ہوا۔ برطانوی سامراجیت سے نجات حاصل کرنے کا شعور رفتہ رفتہ ایک منظم تحریک میں تبدیل ہونے لگا۔ حب الوطنی اور آزادی خواہی کے جذبے کی جلو میں جمہوری اقدار وتصورات کی لے اونچی ہونے لگی۔ فکشن میں جہاں پریم چند نے اس ضمن میں کارہائے نمایاں انجام دیتے ہوئے ہندوستان کی 80 فی صد آبادی یعنی عام انسان اور طبقہ جمہور کو ادب کا مرکز ومحور بنایا۔ وہیں دوسری طرف شاعری کے میدان میں اقبال نے عوامی سطح پر نئی بیداری کی روح پھونکنے میں اپنے شاعرانہ کمال اور جوہر کو بحسن وخوبی آشکارا کیا۔ ان دونوں عظیم ادیبوں کی بدولت ہمارا ادب فکروموضوع اور زبان وپیشکش ہر دو سطح پر عوامی و جمہوری اقدار کی ترجمانی کا ایسا مرقع بن گیا جس کی آب وتاب آج بھی قائم و دائم ہے۔ ہر چند کہ جمہوریت کے تعلق سے اقبال کا یہ شعر:

جمہوریت وہ طرز حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

بادی النظر میں جمہوریت کی نفی پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اہل نظر سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ اقبال نے دراصل اس شعر میں جمہوریت کی نفی کی بجائے سرمایہ دارانہ نظام کی وضع کردہ اس مغربی طرز حکومت کو نشانہ بنایا ہے، جس میں جمہوریت محض ایک فریب بن کر رہ گئی تھی اور جو عوام کی اصل جمہوری قدروں و آرزوؤں کا مظہر بننے کی بجائے استحصال کا حربہ تھی۔ اور اس نام نہاد جمہوری طرز حکومت کی زد میں پوری دنیا کے عوام پامال و پریشان اور استحصال زدہ تھی۔

بقول اقبال:

اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دار حیلہ گر
شاخ آہو پر رہی صدیوں تلک تری برات
ساحر الموط نے تجھ کو دیا برگ حشیش
اور تو اے بے خبر سمجھا اسے شاخ نبات
خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے، یہ ہے آزادی کی نیلم پری

غرض کہ اقبال نے جمہوریت کے سرمایہ دارانہ مغربی ماڈل کو رد کرتے ہوئے اسے مکروفریب کا پیکر قرار دیا ہے۔ نہ کہ جمہوریت کے بنیادی تصور کو رد کیا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو اقبال اپنی نمائندہ نظم ''لینن خدا کے حضور میں'' کے سلسلے کی آخری کڑی ''فرمان خدا'' میں عوامی جمہوریت کی حمایت میں ہرگز یہ نہ کہتے کہ

سلطانی جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقش کہن تجھ کو نظر آئے مٹا دو

دراصل اقبال مغربی تہذیب اور اس کے سامراجی مکروفریب کے ''چکرویو'' سے نالاں تھے اور وہ مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام کی زائیدہ جمہوریت کے ماڈل کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ لہٰذا اس جمہوریت کے ماڈل کے تئیں اقبال کی ناپسندیدگی اور ان کا منفی نقطہ نظر درحقیقت عوامی جمہوریت کی حمایت میں ایک مثبت قدر بن کر نمایاں ہوتا ہے۔

عوامی وجمہوری اقدار کی ترجمانی کے لحاظ سے ترقی پسند ادب کا دور بھی نمایاں حیثیت کا حامل ہے۔ چونکہ ترقی پسند ادب کا رخ غالب طور پر عوامی تھا اس لیے اس ادب میں جمہوری اقدار کی پیشکش پر خاصا زور تھا۔ ہر قسم کے جمہوریت مخالف رویے اور عمل مثلاً غلامی، استحصال، عدم مساوات، جنسی امتیازات، سماجی تفریق وغیرہ کے خلاف ترقی پسند شاعروں اور ادیبوں نے اپنے قلم کو وقف کر دیا تھا۔ نتیجے کے طور پر جمہوریت، آزادی، انصاف اور طبقہ جمہور کی حمایت پر مبنی ادب کا ایک بڑا ذخیرہ ہمارے ادبی سرمایے کا حصہ بنا۔ جوش، فراق، فیض، جذبی، سردار جعفری، ساحر، مجروح، کیفی وغیرہ کی شاعری میں بنیادی فکر کے طور پر عوامی وجمہوری اقدار کی لے نمایاں طور پر موجود ہے۔

اے خدا! ہندوستان پر یہ نحوست تا کجا
آخر اس جنت پہ دوزخ کی حکومت تا کجا
گردن حق پر خراش تیغ باطل تا بہ کے
اہل دل کے واسطے طوق وسلاسل تا بہ کے
(جوش)

اس دور میں زندگی بشر کی
بیمار کی رات ہوگئی ہے
(فراق)

آزادی کے حصول نے ہمیں نم ناک مسکراہٹ عطا کی۔ تقسیم وطن نے جہاں دلوں میں شگاف پیدا کیا وہیں آزادی کے بعد جمہوری اقدار و اصول پر مستعدی وایمانداری سے عمل درآمد کے فقدان نے مایوسی و ناآسودگی سے دوچار کیا۔ ہمارے ترقی پسند شاعروں اور ادیبوں نے آزادی کے بعد قائم جمہوری نظام سے اپنی عدم اطمینانی و ناآسودگی کا اظہار برملا کیا ہے۔ فیض احمد فیض نے ''صبح آزادی'' جیسی نظم لکھ کر اس آزادی کو'' داغ داغ اجالا'' اور'' شب گزیدہ سحر'' سے تعبیر کیا اور'' چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی'' کا نعرہ دیا وہیں سردار جعفری نے اسے فریب سے تعبیر کرتے ہوئے اپنے برگشتہ جذبات کا اظہار ان لفظوں میں کیا۔

ناگہاں شور ہوا
لو شب تار غلامی کی سحر آ پہنچی
انگلیاں جاگ اٹھیں
بربط وطاؤس نے انگڑائی لی
اور مطرب کی حویلی سے شعاعیں پھوٹیں
کھل گئے ساز میں نغموں کے مہکتے ہوئے پھول
لوگ چلائے کہ فریاد کے دن بیت گئے
راہ زن ہار گئے راہ رو جیت گئے
قافلے دور تھے منزل سے بہت دور مگر
خودفریبی کی گھنی چھاؤں میں دم لینے لگے
چن لیا راہ کے روڑوں کو حزف ریزوں کو
اور سمجھ بیٹھے کہ بس لعل و جواہر ہیں یہی
راہ زن ہنسنے لگے چھپ کے کمیں گاہوں میں

دراصل سردار جعفری کی یہ ناآسودگی جمہوری اقدار اور انصاف ومساوات کی سربلندی اور ہر طرح کے استحصال سے آزادی کی تمنا کی زائیدہ ہے جس میں جذبہ بغاوت ایک مثبت قدر بن کر عود آئی ہے۔

ہندوستان میں جمہوریت اور جمہوری اقدار نے بہرکیف اپنی بنیادیں کسی حد تک مستحکم ضرور کیں اس لیے جمہوری اقدار کی پامالی کا رونا ہمارے ادب میں اس شدت سے نہیں جس شدت سے پاکستان کے اردو ادب میں موجود ہے۔ پاکستان میں چونکہ مارشل لا اور فوجی آمریت ایک مستقل قدر بن چکی ہے لہٰذا وہاں کے ادب میں آمرانہ نظام کے خلاف احتجاج اور جمہوری اقدار کی بازیافت کی لے کافی تیز رہی ہے۔ فیض سے لے کر حبیب جالب، احمد فراز، افتخار عارف، منیر نیازی، پروین شاکر، کشور ناہید، فہمیدہ ریاض اور دیگر شعرا و شاعرات کے یہاں اس لے کی گونج صاف سنائی دیتی ہے۔ بطور مثال صرف حبیب جالب کی نظم کے یہ چند بند ملاحظہ کریں۔ جس میں پاکستان کے جمہوری نظام کی ناکامی اور آمرانہ نظام میں موجود تفریق وامتیاز کو بے نقاب کیا ہے۔

اک پٹڑی پر سردی میں اپنی تقدیر کو روئے
دو جا زلفوں کی چھاؤں میں سکھ کی سیج پہ سوئے
راج سنگھاسن پر اک بیٹھا اور اک اس کا داس
بھئے کبیر اداس

اونچے اونچے ایوانوں میں مورکھ حکم چلائیں
قدم قدم پر اس نگری میں پنڈت دھکے کھائیں
دھرتی پر بھگوان بنے ہیں دھن ہے جن کے پاس
بھئے کبیر اداس

کل تک تھا جو حال ہمارا حال وہی ہے آج
جالب اپنے دیس میں سکھ کا کال وہی ہے آج
پھر بھی موچی گیٹ پہ لیڈر روز کریں بکواس
بھئے کبیر اداس

یہ عہد ستم سلسلہ وار کہاں تک
رستے میں اندھیرے کی یہ دیوار کہاں تک
اے صبح میرے دیس میں تو آکے رہے گی
روکیں گے تجھے شب کے طرف دار کہاں تک

ہمارے ملک میں عہد حاضر کے شاعروں اور ادیبوں کے یہاں بھی جمہوری اقدار سے گہری وابستگی کا اظہار ملتا ہے اور جب بھی جمہوری اقدار پر ضرب لگتی ہے۔ ہمارے شعرا وادبا اس کے خلاف ہم آواز ہوکر جمہوریت کی دفاع میں'' پرورش لوح وقلم'' کے عہد پر کاربند نظر آتے ہیں۔ اس آرزو اور تمنا کے ساتھ کہ

سلطنت، فوج، اسلحہ، بارود
مجھ کو تجھ سے یہ سب نہیں درکار
میری دھرتی کو چاہیے خوشبو
میرے آنگن کو رنگ کی بوچھار
میں نہیں کہتا تو میری خاطر
آسمان اک نیا فراہم کر
جی سکوں میں زمیں پہ عزت سے
ایسی آب و ہوا فراہم کر
(ظفر گورکھپوری)

(بشکریہ ماہنامہ'' آج کل''، جنوری 2010)

□□□

وحید الحق

Dyslexia کیا ہے؟

Dyslexia ایک نوع کا عارضۂ اکتساب (Learning Disorder) ہے۔ اکتساب کا یہ عارضہ اپنی اصل کے اعتبار سے اعصابی ہے جس کا تعلق تعلیمی صلاحیتوں سے ہے۔ یہ مرض عموماً بچوں میں پایا جاتا ہے۔ اس مرض کے شکار بچے پڑھنے لکھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ یہ بچے نہ تو کوئی لفظ صحیح طور پر لکھ پاتے ہیں اور نہ ہی لکھے ہوئے لفظوں کا صحیح تلفظ کر پاتے ہیں۔ ہر کام میں ذہن کا عمل دخل ہوتا ہے۔ تمام ذہنی امور دماغ میں پائے جانے والے Biochemical Systems کے ذریعہ انجام پاتے ہیں۔ دماغ کے مختلف حصوں میں مختلف کیمیائی نظام پایا جاتا ہے اور ہر کیمیائی نظام مخصوص امر کو انجام دیتا ہے۔

عام طور پر دماغ کے دو حصے ہوتے ہیں، ایک دایاں (Left) اور دوسرا بایاں (Right)۔ دماغ کے دائیں حصے کو دایاں نصف کرہ (Right Hemisphere) اور بائیں حصے کو بایاں نصف کرہ (Left Hemisphere) کہتے ہیں۔ تعلیمی صلاحیت مثلاً پڑھنا/لکھنا/تلفظ اور زبان کو سیکھنے میں بالعموم دماغ کا بایاں نصف کرہ مدد پہنچاتا ہے، جب کہ دماغ کا دایاں نصف کرہ ہنر کو سیکھنے میں معاون ہوتا ہے۔ ہنر کو سیکھنے کے لیے لکھنے اور پڑھنے کی قطعی ضرورت پیش نہیں آتی۔ موسیقی، رقص، شناوری، کھیل کود، مصوری وغیرہ ہنر ہیں جنھیں سیکھنے کے لیے لکھنا اور پڑھنا ضروری نہیں۔

دماغ کے مختلف حصوں میں پائے جانے والے مختلف قسم کے Chemicals انسان کی تمام حرکت و عمل کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ مثلاً سوچنا، کسی چیز کا احساس کرنا، اکتساب کرنا، بولنا اور لکھنا وغیرہ انسانی دماغ کے امور ہیں اور یہ بھی امور دماغ میں موجود Biochemicals کے ذریعہ عمل میں آتے ہیں۔ کوئی ایک مخصوص Biochemical کسی ایک مخصوص امر کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ لہذا جب کسی ایک امر کو انجام دینے والا Chemical دماغ میں کم ہو جاتا ہے تو اس کمی کے سبب انسان اس امر کو انجام دینے سے معذور ہو جاتا ہے۔ اسی طرح وہ Chemical جو تعلیمی صلاحیت کو حاصل کرنے یا تعلیمی صلاحیت میں اضافہ کرنے میں مدد دیتی ہے، یعنی لکھنے اور پڑھنے میں مدد دیتی ہے، اگر اس کی مقدار دماغ میں کم ہو جاتی ہے تو بچہ لفظوں کو لکھنے اور اس کا صحیح تلفظ کرنے سے عاجز رہتا ہے۔ اسی تعلیمی معذوری کو اکتساب کا عارضہ کہتے ہیں۔

عارضۂ اکتساب کے شکار بچوں کے دماغ میں عام طلبہ کے مقابلے خلیات (Cells) کی ترتیب بھی مختلف ہوتی ہے۔ نیز ان کے امور بھی مختلف ہوتے ہیں۔ دماغ میں خلیات کی بے ترتیبی موروثی بھی ہو سکتی ہے اور ماحولیاتی اثرات (Environmental Effects) بھی اس کے ذمہ دار ہو سکتے ہیں۔ ان بے ترتیب خلیات کے غیر مناسب نشو و نما کے سبب بھی دماغ صحیح طور پر کام کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ البتہ یہ تبدیلی پیدائش سے قبل، پیدائش کے دوران یا پیدائش کے بعد بھی ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ Dyslexia جیسی بیماری عام طور پر بچوں میں پائی جاتی ہے اور بچہ جیسے ہی پڑھنا لکھنا شروع کرتا ہے اس کے کچھ ہی وقت کے بعد اس بیماری کی علامتیں (Symptoms) واضح طور پر نظر آنے لگتی ہیں۔ بس ان علامتوں کو پہچاننے والی نظر چاہیے۔ ایک جائزے کے مطابق یہ کہا جاتا ہے کہ Dyslexia کے شکار تقریباً 88 فی صد بچے ایسے ہیں جن کے قریبی رشتہ دار بھی اس بیماری کے شکار ہیں۔ تعلیمی صلاحیت کا سارا دار و مدار قرأت، تحریر، تلفظ، ریاضیات اور زبان دانی پر ہوتا ہے۔ یہی وہ چیزیں ہیں جن کی مدد سے ہم قدیم اور جدید علوم کو سیکھتے ہیں۔ جو شخص ان چیزوں میں ماہر ہوتا ہے اسے خواندہ اور تعلیم یافتہ تصور کیا جاتا ہے۔ تمام والدین کا یہ خواب ہوتا ہے کہ ان کا لخت جگر بھی تعلیم حاصل کرنے کے بعد کارنمایاں انجام دے جس سے ان کا اور ان کے اسلاف کا نام روشن ہو۔ آج کے دور میں یہ ضروری ہو گیا ہے کہ ہر بچہ تعلیم کے زیور سے خود کو آراستہ کرے، لیکن وہ بچے جو عارضۂ اکتساب (Dyslexia) کے شکار ہیں، اپنے والدین کے خواب کو پورا کرنے میں بعض اوقات ناکام رہتے ہیں۔ اس میں اس قسم کے بچوں کی غلطی قطعی نہیں ہوتی، بلکہ والدین اپنے بچوں کی نفسیاتی پریشانیوں اور الجھنوں کو نہیں سمجھ پاتے اور صرف انھیں اپنی خواہش کے مطابق کامیاب ہوتا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں۔ ناسمجھ والدین اپنے بچوں میں پوشیدہ اس ہنر کو نہیں پہچان پاتے جو قدرت کی طرف سے ودیعت کیا گیا خاص عطیہ ہوتا ہے۔ یہ والدین محض اپنی خواہش کے مطابق بچوں کو جبراً تعلیم دینے کی کوشش کرتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچے تعلیم سے گھبرانے لگتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ عارضۂ اکتساب کے شکار طلبہ علم سیکھنے یعنی لکھنے اور پڑھنے سے دور کیوں بھاگتے ہیں (؟) تو اس کا صحیح جواب ماہرین نفسیات کے مطابق یہ ہے کہ ایسے طلبہ کے دماغ میں ان Chemicals اور خلیات کی کمی یا بے ترتیبی ہوتی ہے جو تحریر، تلفظ، زبان اور ریاضیات کے اکتساب میں مدد دیتے ہیں۔ اس کے برخلاف Dyslexic طلبہ ہر وہ چیز جو انھیں زبانی پڑھائی جاتی ہے بہ آسانی سمجھ لیتے ہیں، لیکن اسی چیز کو وہ تحریری شکل میں پیش کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ تحریر کا صحیح شعور نہ ہونے کی وجہ سے بچہ امتحان میں مسلسل ناکام ہوتا رہتا ہے، لیکن والدین یا اساتذہ یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ ان کا بچہ لاپروا ہے، اور قصداً پڑھنے سے جی چراتا ہے، لیکن نفسیات کا علم یہ کہتا ہے کہ بچہ قصداً ایسا ہرگز نہیں کرتا۔ وہ پڑھنا لکھنا تو چاہتا ہے لیکن اس عمل کے دوران اس کا دماغ خصوصاً دماغ کا وہ حصہ جو لکھنے اور پڑھنے میں مدد دیتا ہے نہایت کمزور ہوتا ہے۔ اسی کمزوری کے سبب بچہ تحریر شدہ لفظوں اور ان کے معنی کے درمیاں ربط قائم نہیں کر پاتا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آج بھی چھوٹے درجات کے طلبہ کو پورے سال زبان اور اس کا رسم خط سکھایا جاتا ہے لیکن امتحان کے دوران اس کی جانچ زبانی (Oral) ہوتی ہے۔ شاید یہ مانا جاتا ہے کہ بچوں کی صلاحیت کا اندازہ ان کی تحریر سے نہیں لگایا جا سکتا۔ یہ بات حق بہ جانب ہے

کہ بچے اپنی زبان کو فطری طور پر اپنے معاشرے میں رہ کر معاشرے کے لوگوں سے گفتگو کرتے ہوئے غیر شعوری طور پر سیکھتے ہیں، لیکن تحریر کا معاملہ قدرے مختلف ہے۔ اگرچہ زبان اور تحریر دونوں ہی ثقافت کا حصہ ہوتے ہیں۔ زبان کو سیکھنے کے لیے دماغ سوزی نہیں کرنی پڑتی، جب کہ تحریر کے لیے رسم خط کو سیکھنا ضروری ہے، اور اس رسم خط کو سیکھنے کے لیے اس کے اصولوں سے مغز ماری کرنی پڑتی ہے۔ وہ بچے جو عارضۂ اکتساب سے پاک ہوتے ہیں، زبان اور اس کے رسم خط کے ساتھ ساتھ ریاضیات بھی جلد سیکھ لیتے ہیں، لیکن جو بچے اس مرض کے شکار ہوتے ہیں ان کو اس کام میں زیادہ وقت لگ سکتا ہے۔ اس سے اساتذہ/والدین کو ناامیدی کا شکار قطعی نہیں ہونا چاہیے، بلکہ یہاں ان کی ذمہ داری بچوں کے تئیں مزید بڑھ جاتی ہے کہ وہ ان پر خاص توجہ دیں اور ان کے ساتھ نرمی اور شفقت سے پیش آئیں۔ وہ بچے جن کو تعلیمی میدان میں اپنے والدین/ اساتذہ سے کوئی مدد نہیں ملتی، خود کو ناکارہ اور احمق سمجھنے لگتے ہیں۔ ان میں سے بعض تو اپنی خود اعتمادی کھونے لگتے ہیں اور زندگی انھیں بے معنی لگنے لگتی ہے۔ ایسے بچے اپنے سماج، اپنے دوستوں یا کنبے کے افراد کے درمیان میل ملاپ قائم نہیں کر پاتے اور گھٹن بھری زندگی جیتے ہیں۔ نتیجتاً رفتہ رفتہ وہ سبھی سے تعلقات منقطع کرنے لگتے ہیں اور تنہائی بھری زندگی کو ترجیح دیتے ہیں۔

یہاں یہ عرض کرنا لازمی ہے کہ آج بھی والدین/اساتذہ یہ تسلیم کرنے سے گریز کرتے ہیں کہ اسکول میں ان کے بچوں کی خراب کارکردگی کے اسباب وعوامل نفسیاتی عوارض بھی ہو سکتے ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ جب بچہ دیگر چیزوں میں تیز طرار ہے تو تعلیمی میدان میں اس قدر پیچھے کیوں کر رہ سکتا ہے؟ ایک عام بچہ عموماً کچھ کوششوں کے بعد لفظوں کو بولنے اور لکھنے لگتا ہے، لیکن اگر بچہ مستقل کوشش کر رہا ہے اس کے باوجود وہ لفظوں کے درمیان امتیاز قائم نہیں کر پا رہا ہے اور ہر لفظ کو غلط املا کے ساتھ لکھ رہا ہے تو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ وہ عارضۂ اکتساب کا شکار ہے۔ اس قسم کے بعض طلبہ تیز طرار اور ذہین تو ہوتے ہیں لیکن محنت و کاوش کے باوجود امتحان میں اچھے نمبر حاصل کرنے سے قاصر رہتے ہیں، بلکہ بعض دفعہ قطعی طور پر ناکام ہو جاتے ہیں۔ ان کے اندر کچھ کرنے کی صلاحیت اور ان کی کارکردگی کے درمیان پایا جانے والا یہی فرق عارضۂ اکتساب کا مسئلہ ہے۔

عارضۂ اکتساب کے شکار بچوں سے جب بلند خوانی کے لیے کہا جاتا ہے تو وہ اسے اچھا نہیں سمجھتے اور اگر کسی خوف سے وہ بلند خوانی کرتے بھی ہیں تو اس بلند خوانی کی رفتار بہت دھیمی ہوتی ہے۔ ایسے بچے ہر لفظ کو ٹھہر ٹھہر کر اور اٹک اٹک کر ادا کرتے ہیں۔ لفظوں کا تلفظ بھی اصل املا کے مطابق نہیں کرتے۔ Dyslexic طلبہ کی تحریر میں سست رفتاری بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ یہ بچے ہر لفظ کو آہستہ آہستہ لکھتے ہیں۔ لکھنے کے دوران وہ پنسل/قلم کو باقاعدہ طریقے سے نہیں پکڑتے۔ بار ہا بتانے اور سمجھانے کے باوجود وہ اپنی عادت کے مطابق ہی قلم/پنسل کو پکڑتے ہیں۔ ایسے بچوں کو ہاتھ پکڑ کر لکھنا سکھانا چاہیے۔ جس وقت وہ پنسل/قلم کو ہاتھ میں پکڑیں اسی وقت ہلکی سی تنبیہ کے ساتھ انھیں اس قسم کی چیزوں کو تھامنے کا صحیح طریقہ بتانا چاہیے۔ اگر بچپن ہی میں اسے غلط طریقے سے پنسل/قلم پکڑنے کی عادت لگ گئی تو پھر تا حیات وہ اسی عادت کے مطابق پنسل/قلم پکڑتا رہے گا۔

Dyslexic طلبہ کی تحریر اس قدر سست ہوتی ہے کہ وہ اپنی کلاس کا کام بھی مکمل نہیں کر پاتے۔ امتحان کے دوران وہ تمام سوالات کے جوابات نہیں لکھ پاتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ امتحان میں ناکام ہو جاتے ہیں۔ Dyslexic طلبہ ہزار کوششوں کے باوجود لفظوں کا صحیح تلفظ نہیں کر پاتے، اس لیے کہ وہ حروف اور الفاظ کو صحیح طور پر پہچان نہیں پاتے۔ لفظوں کی تشکیل میں حروف کی ترتیب کو یاد نہیں رکھ پاتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں حروف کے الٹ پھیر کو کثرت سے دیکھا جا سکتا ہے۔ مثلاً ایسے بچوں کے نزدیک ب، ت اور ث میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ وہ ان حروف کو شکل و شباہت کی یکسانیت کے سبب ایک ہی جیسا سمجھتے ہیں۔ بہت سی زبانیں ایسی ہیں جن کے بعض حروف تحتی بصری سطح پر یکساں ہوتے ہیں اور بعض صوتی سطح پر ایک دوسرے کے مشابہ ہوتے ہیں۔ مثلاً اردو کے بعض حروف ب، ت، ٹ، ث، اسی طرح د، ڈ، ذ وغیرہ بصری سطح پر یکساں ہیں۔ ایسی صورت میں Dyslexic طالب علم مغالطے میں پڑ جاتا ہے۔ کبھی حروف کی ظاہری شکل وصورت کی بنا پر اور کبھی صوتی یکسانیت کے سبب وہ حروف کا صحیح ادراک نہیں کر پاتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کبھی لکھ بیٹھتا ہے۔ اسی طرح 'س' سے شروع ہونے والے لفظ کو کبھی 'ص' تو کبھی 'ش' اور کبھی اصل املا کے مطابق لکھتا ہے۔ کہنا مقصود یہ ہے کہ اس قسم کے طلبہ ہمیشہ مغالطے میں رہتے ہیں۔ اسی طرح ریاضیات کے ہندسوں اور علامتوں کے درمیان امتیاز قائم کرنا ان کے لیے نہایت مشکل ہوتا ہے۔ کبھی انگریزی کے 6 کو 9 اور کبھی 9 کو 6 لکھ دیتے ہیں۔ اسی طرح ضرب (×) کی علامت کو جمع (+) کی علامت سمجھ بیٹھتے ہیں۔ ایسے طلبہ نہ ہندسوں کو صحیح طور پر جوڑ پاتے ہیں اور نہ گھٹا پاتے ہیں۔ ان کے لیے گھڑی پہچاننا اور وقت بتانا بھی ایک مشکل مرحلہ ہے۔ یہ بچے گھڑی دیکھ کر بھی صحیح وقت نہیں بتا پاتے۔ اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ وہ ہندسوں کو ان کی بناوٹ کے مطابق پہچان نہیں پاتے۔ ایسے بچے اپنی بات دوسروں تک واضح طور پر پہنچانے میں ناکام رہتے ہیں۔ اپنے خیالات و افکار جملوں کی شکل میں پیش کرنا ان کے لیے امر محال ثابت ہوتا ہے اور اگر کسی طور اپنے خیالات پیش کرتے بھی ہیں تو جملوں میں ربط و ترتیب کی کمی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ بچے اپنے استاد کے ذریعہ پوچھے گئے کسی سوال کا جواب تشفی بخش اور باقاعدہ طور پر نہیں دے پاتے، جب کہ استاد کو یہ گمان گذرتا ہے کہ بچہ جواب دینے میں تساہلی/سستی اور بے توجہی سے کام لے رہا ہے۔ ایسے طلبہ کی تحریریں مبہم سی ہوتی ہیں۔ ان میں صراحت وصفائی نہیں پائی جاتی۔

عارضۂ اکتساب (Learning Disorder) کے سبب ہی بچے دنوں کے نام بھی یاد نہیں رکھ پاتے اور نہ ہی ان کے درمیان فرق قائم کر پاتے ہیں۔ ان کو یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ گذرا ہوا دن کون سا تھا اور آنے والا دن کون سا ہوگا۔ سمتوں کی شناخت میں بھی ایسے طلبہ اکثر و بیشتر ناکام رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ دوری و نزدیکی اور رفتار کو بھی یہ اچھی طرح نہیں بتا پاتے۔ Dyslexic طلبہ اپنے مزاج اور رویے کے اعتبار سے دیگر طلبہ

سے کسی قدر مختلف ہوتے ہیں۔ ایسے طلبہ میں شرارت، لاپروائی، بے فکری، شوخی اور چلبلا پن جیسی چیزیں ضرورت سے زیادہ دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ایسے بچوں کی حرکت وعمل اور کارکردگی کے تئیں اکثر گھر پر والدین اور اسکول میں اساتذہ نہایت فکرمند رہتے ہیں۔ جب ان بچوں کی اصلاح کی غرض سے والدین یا اساتذہ سرزنش کرتے ہیں تو یہ بچے ان کا منفی اثر قبول کرتے ہیں۔ اس کا ردعمل یہ ہوتا ہے کہ یہ بچے ضدی ہوجاتے ہیں اور منفی ومخالفانہ رویہ اختیار کرلیتے ہیں۔Dyslexic طلبہ پڑھنے سے ہر لمحہ جی چراتے ہیں۔ جب کوئی شخص انھیں سبق پڑھاتا ہے، اس وقت بھی وہ توجہ سے کام نہیں لیتے۔ وہ پڑھنا تو چاہتے ہیں لیکن ساتھ ہی یہ بھی چاہتے ہیں کہ کوئی نرم مزاج شخص ان کو سبق پڑھائے، اس لیے کہ یہ بچے خود کسی سبق کو پڑھ کر سمجھنے کے قابل نہیں ہوتے۔ اس صورت میں اساتذہ کا فرض ہے کہ وہ اپنے مزاج اور رویے میں تبدیلی لائیں۔ نیز خود کو بچے کی خواہش کے مطابق نرم مزاج بنائیں۔ جب کوئی شخص نرم مزاجی سے پڑھاتا ہے تو یہ بچے بھی سبق پڑھنے اور سمجھنے میں اپنی توجہ صرف کرتے ہیں، اور پوچھے جانے والے ہر سوال کا امکانی جواب بھی دینے کی خاطر خواہ کوشش کرتے ہیں، لیکن یہ جواب صرف زبانی(Oral) اور تقریری سطح پر ہوتا ہے۔ ایسے طلبہ آوازوں کی مدد سے تو چیزوں کو بہ آسانی سمجھ لیتے ہیں لیکن تحریری مدد سے کسی بھی چیز کو سمجھنا یا سمجھانا ان کے لیے سعی لاحاصل ثابت ہوتا ہے۔ دراصل تمام خاص وعام بچے کے ساتھ یہی ہوتا ہے کہ جب وہ کسی چیز کا نام صوتی سطح پر بار بار سنتے ہیں تو ان کے ذہن میں اس چیز کی ایک مثالی شبیہ مرتسم ہوجاتی ہے اور یہ شبیہ ذہن میں محفوظ رہتی ہے۔ اگلی مرتبہ جب بھی اس چیز کا نام صوت کی شکل میں ان کے کانوں سے ٹکراتا ہے تو فوراً ان کے ذہن میں اس صوت کا رشتہ اس کے معنی سے قائم ہوجاتا ہے اور معنی کی شبیہ جو ذہن میں پہلے سے موجود ہے حرکت میں آجاتی ہے۔ یہ عمل نہایت برق رفتاری سے ہوتا ہے۔ اسی عمل کے ذریعہ Dyslexic طلبہ بھی اسماء کے نام اور ان کے کام جان پاتے ہیں۔ اگرچہ زیادہ تر اپنے مشاہدے پر یقین رکھتے ہیں لیکن تحریر شدہ لفظوں کی مدد سے کچھ نہیں سیکھ پاتے۔ سبب یہ ہے کہ الفاظ آوازوں کا مجموعہ ہونے کے علاوہ معنی کا نقش ہوتے ہیں اور جب تک یہ الفاظ کاغذ پر ہوتے ہیں، خاموش رہتے ہیں، لیکن جیسے ہی یہ زبان پر آتے ہیں ان میں حرکت شروع ہوجاتی ہے اور یہ اصوات میں تبدیل ہوجاتے ہیں۔Dyslexic طلبہ کی سب سے بڑی معذوری یہی ہے کہ وہ تحریر شدہ لفظوں کو نہیں پڑھ پاتے اور جب پڑھ نہیں پاتے تو اس کے معنی بھی بتانے سے قاصر رہتے ہیں۔ یہ طلبہ سبق کی عبارت کو لفظ بہ لفظ ٹھہر ٹھہر کر پڑھتے ہیں اور اس کے لیے مسلسل ایک ہی سر یا لہجہ اختیار کرتے ہیں۔ پڑھتے وقت یہ بچے اپنی قوتِ قیاس سے زیادہ کام لیتے ہیں۔ بعض مرتبہ لفظوں کو حذف کرجاتے ہیں اور بعض دفعہ ان کی ادائیگی قیاس کے مطابق کرتے ہیں۔ رموز واوقاف کا بھی خاطر خواہ خیال نہیں رکھتے۔ اگرچہ ہر سطر اور ہر لفظ کے نیچے انگلی رکھ کر پڑھتے ہیں۔

سات سال تک کی عمر کے Dyslexic طالب علم کو لکھنے اور پڑھنے میں دقتیں پیش آسکتی ہیں لیکن اگر اس کے بعد بھی وہ لکھنا اور پڑھنا نہیں سیکھ پاتا تو وہ مایوسیوں کا شکار ہونے لگتا ہے۔ خود کو بے بس اور لاچار محسوس کرنے لگتا ہے۔ تعلیم کے ذریعہ حاصل ہونے والی لذت سے محروم ہونے لگتا ہے اور اسکول اس کے لیے ذہنی بوجھ بن جاتا ہے۔ اس کے دل میں امتحان کا خوف بیٹھ جاتا ہے۔ وہ اسکول جانے سے گھبراتا ہے، اور ذہنی تناؤ کے سبب نہ اسکول کے ساتھیوں میں گھل مل پاتا ہے اور نہ ہی گھر والوں کے ساتھ خوش اخلاقی وخوش سلیقگی کا مظاہرہ کرتا ہے۔Dyslexic طلبہ وقت کے ساتھ ساتھ افسردگی کا شکار ہوتے ہیں اور پھر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ خود کو سست اور احمق سمجھنے لگتے ہیں۔ بعض طلبہ تو اپنی خوداعتمادی کھو بیٹھتے ہیں اور زندگی سے بےزار ہوجاتے ہیں۔ ان کے رویے میں جارحیت اور مخالفت پنپنے لگتی ہے۔ نیز بے توجہی اور چڑچڑے پن کا احساس ہونے لگتا ہے۔ ایسے Dyslexic طلبہ علم سے فرار حاصل کرنے کے لیے ٹی۔وی، کمپیوٹر اور مختلف قسم کے کھیلوں میں خود کو مصروف رکھنا پسند کرتے ہیں۔ اگرچہ عارضۂ اکتساب کے شکار بچے عموماً تیز طرار ہوتے ہیں، ان کے پاس عام ذہانت موجود ہوتی ہے۔ نیز ان کا حافظہ بھی خاطر خواہ مضبوط ہوتا ہے۔ وہ سوالوں کا جواب تقریری سطح پر دینے کے اہل ہوتے ہیں، لیکن کاغذ پر لکھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صحیح جواب جانتے ہوئے بھی یہ بچے لفظوں اور جملوں کی عدم واقفیت کے سبب صحیح جواب کاغذ پر نہیں لکھ پاتے۔ بہ الفاظ دیگر یہ بچے جو لکھنا چاہتے ہیں اسے صحیح ڈھنگ سے کاغذ پر لکھ نہیں پاتے۔ ایسے طلبہ کو ہر طرح سے مدد کی ضرورت ہے۔ یہاں یہ کہنا ضروری ہے کہ تمام Dyslexic طلبہ یاس وحرمان کا شکار نہیں ہوتے بلکہ اپنی کوششوں سے اہم کارنامے انجام دیتے ہیں۔ بعض طلبہ Dyslexia جیسے نفسیاتی مرض پر قابو پانے کے لیے کوشش کرتے ہیں اور وہ اپنی کوشش میں خاطر خواہ کامیاب بھی ہوجاتے ہیں۔ بعض Dyslexic طلبہ ایسے ہوتے ہیں کہ لفظوں کی ادائیگی میں تو ہکلاتے ہیں لیکن بہترین شناور بن جاتے ہیں۔ بعض کسی معمے کو حل نہیں کر پاتے لیکن شطرنج کے ماہر ہوجاتے ہیں۔ اسی طرح بعض Dyslexia کے شکار بچے موسیقی، رقص، کھیل کود، مصوری، معماری اور زراعت میں عمدہ کارکردگی کا مظاہرہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

Tom Cruise, Dan O' Brain, Churchill, Da Vinci, Einstein, Edison وہ عظیم شخصیتیں ہیں جو بچپن میں عارضۂ اکتساب (Dyslexia) کے شکار تھے، لیکن اپنی محنت اور کاوشوں سے اپنے اندر کی پوشیدہ صلاحیتوں کو پہچاننے میں کامیاب ہوئے۔ ان میں کوئی قائد بنا تو کوئی مصور، کوئی سائنس داں تو کوئی موجد۔ آج بھی عارضۂ اکتساب کے شکار طلبہ میں قدرت کی طرف سے ودیعت کی گئی صلاحیتوں کو تلاش کیا جاسکتا ہے اور ان کی تربیت/تراش خراش کے بعد انھیں ان کی پہچان دلائی جاسکتی ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ بچوں کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ زندگی کے جس شعبے میں بچوں کی دلچسپی ہو انھیں اسی شعبے میں جانے کی اجازت دی جائے، بلکہ راستے میں آنے والی تمام پریشانیوں اور رکاوٹوں کو دور کرنے کی کوشش کی جائے لیکن یہ کام اساتذہ اور والدین کے سوا کوئی دوسرا نہیں کرسکتا۔ □□□

پتہ:
Deptt.of Urdu,Faculty Of Arts,AMU,Aligarh-202002(U.P.)

ایم نسیم اعظمی

ہنرمندی کے بعض ووکیشنل کورسز

آج کے صنعتی و اطلاعاتی انقلاب کے دور میں بھی ہنرمندی اور دستکاری کی اپنی الگ حیثیت ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ہنرمندی اور دستکاری سے وابستہ کئی ایسے کورسز رائج ہیں جن میں سے اپنے مزاج اور پسند کے مطابق کارآمد کورس کا انتخاب کرکے اپنے بہتر کیریئر کے لیے ان کی تعلیم و تربیت حاصل کی جاسکتی ہے۔

یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ فی زمانہ پیشہ ورانہ اور مارکیٹ اورینٹڈ کورسوں کی اہمیت دن بدن بڑھتی جارہی ہے خصوصاً ایسے طالب علموں میں جو دسویں یا بارھویں کے بعد کسی بھی وجہ سے پڑھائی جاری رکھنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں ایسے میں ووکیشنل کورسز ہی ان کے روشن اور تابناک مستقبل کے لیے سب سے زیادہ اہمیت کے حامل ہوتے ہیں چنانچہ ووکیشنل تربیتی کورسز، ٹیکنیکل کورسز اور مختلف قسم کی ہنرمندیوں پر مبنی کورسوں کی بدولت لاکھوں اور کروڑوں کی تعداد میں نوجوان نوکری، ملازمت یا خود روزگاری کے ذریعے اپنی زندگی اور مستقبل کو خوشگوار بنانے کے لیے سرگرم عمل ہیں۔ کیونکہ آج کے دور میں بھی ٹیکنیکل اور شارٹ ٹرم کورسوں کی اپنی الگ افادیت ہے اور یہی سبب ہے کہ سرکاری، نیم سرکاری اور پرائیویٹ اداروں میں اس قسم کی پیشہ ورانہ اور ہنرمندانہ پڑھائی اور تربیت کی سہولیات کا اہتمام کیا جانے لگا ہے۔ ذیل میں بعض اہم ووکیشنل کورسوں اور ان کی تفصیلات درج کی جاتی ہیں۔

1. **سرٹیفکیٹ ان جیری ٹرک کیئر:** یہ قلیل مدتی کورس صرف چھ ماہ کی مدت پر مشتمل ہوتا ہے جس میں تحریری امتحان کی بنیاد پر داخلہ لیا جاتا ہے اور درخواست دہندہ کو صرف دسویں (ہائی اسکول) پاس ہونا ضروری ہوتا ہے اور عمر کی حد 18 سال سے 45 سال ہوتی ہے۔ اس کورس کی تعلیم و تربیت کا اہتمام سماجی انصاف کی وزارت کے تحت نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف سوشل ڈیفنس کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ اس کورس کے کرنے کے بعد این.جی.او. (NGO) سرکاری کارپوریٹ سیکٹر اور اکاڈمک انسٹی ٹیوشن میں روزگار کے اچھے امکانات ہوتے ہیں۔ مزید جانکاری کے لیے درج ذیل پتوں پر رابطہ کیا جاسکتا ہے۔

- سنٹرل فٹ ویئر ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ۔ 65/2 جی.ایس.ٹی.روڈ، گوئنڈی۔ چنئی (تامل ناڈو)
- سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف فٹ ویئر۔ آگرہ (یوپی)
- ایف.ڈی.ڈی.آئی.نوئیڈا (یو.پی)

2. **ملٹی میڈیا کورسز:** دسویں پاس کے بعد ملٹی میڈیا کورس روزگار کے پیش نظر کافی کارآمد ہوتا ہے۔ اس میں گرافک، ڈیزائننگ، ویب ڈیزائننگ، 3 ڈی ماڈلنگ اور اینی میشن جیسے کورس ہوتے ہیں۔ اس کورس کو سرکاری ادارہ این.ایس.آئی.سی. (NSIC) سے کیا جاسکتا ہے اس کے علاوہ دیگر پرائیویٹ ادارے بھی اس کا اہتمام کرتے ہیں۔ تین یا چھ ماہ کی مختصر مدت کے اس کارآمد سرٹیفکیٹ کورس کی فیس تقریباً بیس ہزار ہوتی ہے۔ مگر یہ کورس کئی لحاظ سے انتہائی کارآمد اور فائدہ مند ثابت ہورہا ہے اور ہندوستان کے تقریباً ہر چھوٹے بڑے شہر وقصبات میں اس کی سہولیات میسر ہیں۔

3. **الکٹرانک سامانوں کی مرمت کے کورسز:** الکٹرانک سامانوں کی مرمت سے متعلق بہت سے سرٹیفکیٹ اور ڈپلوما کورسز رائج ہیں جو کم مدت میں کیے جاسکتے ہیں اور جن کے تحت ریڈیو، ٹی.وی، کمپوننٹ لیول، ری پیئر آف الکٹرانکس گجٹس، ری پیئر اینڈ مینٹی ننس آف موبائل فون وغیرہ میں تربیت حاصل کرکے خود کا سروس سنٹر کھولا جاسکتا ہے۔ اس قسم کے سبھی کورسوں میں داخلے کے لیے امیدوار کا دسویں (ہائی اسکول) پاس ہونا ضروری ہوتا ہے۔ یہ کورسز عموماً کم سے کم دو ہفتے اور زیادہ سے زیادہ ایک سال کی مدت کے ہوتے ہیں جس میں داخلہ اور دیگر ضروری معلومات کے لیے سرکاری ادارہ این.ایس.سی.آئی. (NSCI) اوکھلا، نئی دہلی 110020 سے رابطہ قائم کیا جاسکتا ہے۔

4. **اپیرل پیٹرن میکنگ کورسز:** دسویں کے بعد گارمنٹ میکنگ، ٹکنکس یا انڈسٹریل سوئنگ مشین کا ٹکنیشین سرٹیفکیٹ کورس اپنی نوعیت کا انتہائی اہم کورس تصور کیا جاتا ہے۔ اس کورس کی مدت چار سے چھ ماہ کی ہوتی ہے۔ کپڑا وزارت حکومت ہند کے تحت اپیرل ایکسپورٹ کونسل کے زیراہتمام اپیرل ٹریننگ اینڈ ڈیزائننگ سنٹر سے اس کورس کی تعلیم و تربیت حاصل کی جاسکتی ہے۔ یہ کورس ملازمت اور خود روزگاری کے معاملے میں انتہائی مفید اور کارآمد مانا جاتا ہے۔

5. **پیپر کرافٹ کلے ماڈلنگ کورسز:** پیپر کرافٹ کے علاوہ کلے ماڈلنگ، پیپر میشے، گولڈ سانچے، پینٹنگ، ڈرائنگ یا ٹوائے میکنگ کے کورس کی

تربیت کے بعد کام کی کوئی کمی نہیں رہتی ہے۔ یہ کورس وزارت صنعت دہلی سرکار کے زیر اہتمام چلائے جاتے ہیں۔ اس میں داخلے کے لیے امیدوار کا کم از کم ہائی اسکول پاس ہونا ضروری ہوتا ہے۔

6. **فائنس اکاؤنٹنگ اینڈ آڈیٹنگ کورسز:** یہ کورس ہریانہ کے پالی ٹیکنک اداروں میں چلائے جاتے ہیں۔ جن میں داخلے کے لیے امیدوار کا کم از کم ہائی اسکول ہونا ضروری ہوتا ہے۔ یہ کورسز دو سے تین سال کی مدت پر مشتمل ہوتے ہیں جن کی تکمیل کے بعد اسمال اسکیل بزنس، چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ، کمپنی سکریٹری کے علاوہ انشورنس اور فائنس کمپنیوں میں بہتر روزگار کے مواقع ہوتے ہیں۔

7. **کاسٹیوم انٹیریئر ڈیزائننگ:** انٹیریئر ڈیکوریشن کا کورس کر کے معمولی تجربے کے بعد اچھا روزگار حاصل کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً مکانات کی تعمیر میں اچھے انٹیریئر ڈیکوریٹرس کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ کاسٹیوم ڈیزائن کے شعبے میں بھی بہتر روزگار کے مواقع ہوتے ہیں۔ ان دونوں کورسوں کی تکمیل کے لیے تین سال کی مدت درکار ہوتی ہے۔ یہ کورس مختلف سرکاری ویمنس پالی ٹیکنک اداروں سے کیے جاسکتے ہیں اور ان کی تکمیل کے بعد ملازمت اور خود روزگاری کے اچھے امکانات سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

8. **آپریشن تھیٹر اسسٹنٹ کورس:** یہ ایک سالہ کورس پوسٹ گریجویٹ انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل ایجوکیشن اینڈ ریسرچ، چنڈی گڑھ سے کیا جاسکتا ہے۔ اس میں داخلہ تحریری امتحان اور انٹرویو کی بنیاد پر کیا جاتا ہے اور طالب علموں کو معقول وظیفہ بھی دیا جاتا ہے۔ اس کورس کی تکمیل کے بعد سرکاری اور غیر سرکاری ملازمت کے اچھے مواقع ہوتے ہیں۔

9. **ٹول اینڈ ڈائی میکنگ:** ٹول اینڈ ڈائی میکنگ کے اس دو سالہ کورس میں عموماً جون، جولائی مہینے میں داخلے ہوتے ہیں، جس میں مختلف پروڈکشنوں کی تیاری کا عمل اور اس عمل میں استعمال ہونے والے سانچے یا ڈائی بنانے کے کام کی تربیت دی جاتی ہے۔ مزید جانکاری کے لیے اپنے علاقے کے آئی.ٹی.آئی. (ITI) سے رابطہ کیا جاسکتا ہے۔

10. **الکٹرانک سامان پروڈکشن اینڈ مینٹی ننس میں ڈپلوما:** یہ کورس بھارت سرکار کے الکٹرانک محکمے کے تحت سنٹر فار الکٹرانک ڈیزائن اینڈ ٹیکنالوجی، مرٹھواڑہ یونیورسٹی کیمپس اورنگ آباد (مہاراشٹر) میں کرایا جاتا ہے اس میں داخلے کے لیے تحریری امتحان میں کامیابی حاصل کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اس کورس کی مدت تین سال کی ہوتی ہے اس کے علاوہ فوڈ کرافٹ انسٹی ٹیوٹ آف ہوٹل مینجمنٹ، کیٹرنگ اینڈ اپلائڈ انسٹی ٹیوشن میں بھی درج ذیل کورسز کی تعلیم و تربیت کا معقول بندوبست ہے۔

- ڈپلوما ان فوڈ پری پریشن اینڈ فوڈ پروڈکشن ٹیکنالوجی۔
- ڈپلوما ان ہوٹل ریسپشن اینڈ فرنٹ آفس مینجمنٹ۔
- ڈپلوما ان ریسٹورنٹ اینڈ کیٹرنگ مینجمنٹ۔
- ڈپلوما ان ہوٹل ریسپشن اینڈ بک کیپنگ۔
- سرٹیفکیٹ کورس ان بیکری اینڈ کنفکشنری۔

مذکورہ بالا سبھی کورسز دہلی، لکھنؤ، پانی پت، چنڈی گڑھ، احمد آباد، ترچنا پلی، پونے، بھوپال، حیدرآباد، بھونیشور اور گوا وغیرہ میں بھی بآسانی کیے جاسکتے ہیں اور ان کی تکمیل کے بعد بہتر ملازمت اور روزگار سے اپنی زندگی کو خوشگوار بنایا جاسکتا ہے۔

□□□

پتہ:
"Adeela Publications"
Doman Pura (Kasari)
Maunath Bhanjan
(U.P.) 275101

رام پرشاد بسمل کی آپ بیتی

مرتب: ڈاکٹر وشوامترا اپادھیائے/مترجم: احسان احمد صدیقی

رام پرشاد نے یہ آپ بیتی گورکھ پور جیل میں اپنی پھانسی 19 دسمبر 1927 کے دو دن قبل مکمل کی تھی۔ رام پرشاد بسمل کے سینے میں جو آگ تھی اور جو مقصد پیش نظر تھا اس کا خلاصہ انھوں نے اس آپ بیتی میں بیان کیا ہے جس میں ان کی اپنی مفلوک الحال خانگی زندگی، نامساعد ایام، ایام جوانی، ازدواجی زندگی، والدین اور مذہبی و سیاسی تعلیمات کے ساتھ اپنے اندر پیدا ہونے والے حب وطن کے جذبے کی وجوہات، کاکوری ریلوے ڈکیتی، اپنی گرفتاری، جیل کے واقعات، پھانسی کی کوٹھری اور زندگی کے آخری لمحات کی باتیں بڑی دل خراش ہیں۔

صفحات: 109، قیمت -/33 روپے

عبدالحلیم ندوی

(ہماری مطبوعات سے)

عربی زبان

عربی زبان اپنی اصلی شکل میں کس طرح وجود میں آئی، اس کا یقینی پتہ لگانا بڑا مشکل کام ہے۔ کیونکہ جس وقت اس کی تاریخ واضح شکل میں ہمارے سامنے آئی ہے۔ وہ اسلامی زمانہ ہے اور اس وقت عربی زبان اپنے عروج کو پہنچی ہوئی تھی۔ اس سے پہلے جن مرحلوں سے یہ زبان گزری ہے اس کے متعلق کوئی بات اب تک یقین سے نہیں کہی جاسکتی تھی، مگر اب مستشرقین اور آثار قدیمہ کے ماہروں نے یمن، شام اور شمالی حجاز میں دریافت شدہ ان کتبوں سے جو پتھروں، مندروں، لاٹھوں، چہار دیواریوں گنبدوں اور قلعوں میں ملے ہیں، عربی زبان سے متعلق بہت سی اہم باتیں معلوم کرلی ہیں۔ چنانچہ ان کتبوں اور نقوش کو ان علما نے تین گرہوں میں تقسیم کیا ہے جن سے مندرجہ ذیل تین لہجوں کا پتہ چلتا ہے:

(1) جنوبی عربی لہجے: اس زبان کے کتبے یمن کے علاقہ قتبان، معین اور سبا وغیرہ میں ملے ہیں، جہاں اس لہجہ کا رواج تھا۔

(2) شمالی عربی لہجے: اس زبان کے کتبے حجاز کے شمال میں ثمود کے رہنے کی جگہوں میں ملے ہیں۔

(3) آرامی نبطی لہجے: یہ لہجے مذکورہ بالا لہجوں کے مقابلے میں سنے ہیں۔ ان لہجوں کے لکھنے میں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان سب زبانوں کے لکھنے اور بولنے میں بڑا اختلاف تھا۔ مگر بعد میں حالات کے تقاضوں سے لہجوں کا یہ اختلاف مٹ گیا اور سب کے میل جول اور خاص طور سے دینی تقاضوں کے ماتحت ایک خوبصورت صاف ستھری اور شیریں زبان نکل آئی۔

اصل بات یہ ہے کہ عرب قوم ان پڑھ قوم تھی۔ قوموں اور گروہوں میں تعلقات اور ربط وضبط قائم کرنے کی ساری بنیادیں، مثلاً دین، تجارت یا حکومت، ان میں سے کوئی چیز ان میں ایسا میل جول اور تعلق نہ پیدا کرسکی جس سے آپس میں گہرا تہذیبی اور لسانی لین دین پیدا ہوسکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مختلف قبائل ایک ہی چیز کو مختلف ناموں سے پکارنے لگے اور ایک ہی مقصد کو ادا کرنے کے لیے الگ الگ طریقۂ ادا اختیار کرنے لگے، زندگی چونکہ خانہ بدوشانہ تھی، اس لیے شروع میں دوسروں سے اخذ کرنے کے مواقع بہت کم ملتے تھے، مگر جب ان کا تعلق دوسروں سے ہوا تو ان کی زبان میں بھی ان قبیلوں کے الفاظ آنے شروع ہوئے اور اس طرح ان کی زبان میں تبدیلی آنی شروع ہوئی اور ایک ہی معنی کے لیے مختلف قبائل میں مختلف الفاظ اور تعبیریں آئیں اور اس سے مترادفات کی کثرت ہوئی۔ پھر تعلیل وغیرہ کے اختلاف سے لہجوں میں بہت اختلاف ہوگیا۔ اس کے علاوہ بہت بڑا اختلاف بعض جملوں، بعض الفاظ اور حروف کو مروج طریقوں کے علاوہ مختلف طریقوں سے ادا کرنے کی وجہ سے بھی پیدا ہوا جیسے قبیلہ مازن کا ''ابدال'' کا طریقہ[1] یا ''اتمام ونقص''[2] کا رواج جو قبیلہ خثعم اور زبید میں رائج تھا یا جیسے قبیلہ قضاعہ کا ''عجعجہ''[3] یا حمیر کا ''طمطمانیہ'' ہذیلیوں کا ''فحفحہ'' یا قبیلہ تمیم کا عنعنہ' قبیلہ ربیعہ یا اسد کا ''کشکشہ'' اور قبیلہ طئی کا ''قطعہ''۔

عربی زبان کی تقسیم

قبائل کے مختلف لہجات میں مذکورہ بالا اختلاف کی وجہ سے علمائے لغت نے عربی زبان کو دو قسموں میں بانٹ دیا ہے۔

1. جنوبی عربی زبان: جو یمن میں رائج تھی۔
2. شمالی عربی زبان: جو حجاز میں رائج تھی۔

جنوبی عربی زبان میں جو یمن میں بولی جاتی تھی۔ سبا اور حمیر کی زبان شامل تھی۔ مگر فوقیت حمیر کی زبان کو حاصل تھی اس لیے اس کو حمیری زبان بھی کہتے ہیں۔ اور جیسا کہ پہلے بیان ہوا یہ شمالی زبان یعنی حجازی کے مقابلے میں زیادہ قدیم زبان ہے، کیونکہ یہ یمنیوں کی اصل زبان تھی۔ جنوب میں یمنیوں کی یہ زبان شمال میں عدنانیوں کی زبان سے بہت مختلف تھی۔ یمن میں جو کتبے وغیرہ ملے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ جنوبی یمنی زبان، شمال کی عدنانی زبان سے نہ صرف صیغوں، تنوین، جمع مذکر سالم اور ضمیروں وغیرہ میں مختلف تھی بلکہ اس کے حروف تہجی بھی بڑی حد تک مختلف تھے۔ اسی لیے مشہور لغت کے عالم عمرو بن علاء نے کہا تھا کہ ''مالسان حمیر من لساننا شیئ، وما لغتهم من لغتنا شیئ'' یعنی نہ تو حمیر (یمن) کی زبان ہماری زبان ہے اور نہ ان کی لغت ہماری لغت۔

'عربی ادب کی تاریخ''(جلد اوّل) سے ماخوذ، مصنف: ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی، صفحات 352، قیمت: -/86

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔

شمالی علاقہ حجاز میں جو عربی بولی جاتی تھی، وہ عدنانیوں کی زبان تھی اور جیسا کہ پہلے بیان ہوا یہ یمنی زبان کے مقابلے میں نئی زبان تھی اور ہمارے اس جاہلی شاعری کا جو سرمایہ پہنچا ہے وہ اسی عدنانی لہجہ میں ہے، کیونکہ یہ جن شعرا کا کلام ہے وہ یا تو قبیلہ ربیعہ سے تعلق رکھتے تھے جیسے لاعشی اور طرفہ بن العبد جو قبیلہ تغلب سے تعلق رکھتے تھے یا مضر سے، جیسے النابغہ الذبیانی اور عنترہ بن شداد العبسی جن کا تعلق قبیلہ مضر سے تھا اور یہ دونوں قبیلے عدنان کی شاخیں ہیں۔ یا اگر کوئی شاعر نسلاً یمنی (4) ہے بھی، تو وہ ان قبیلوں سے تعلق رکھتا ہے جو شمال کی طرف ہجرت کر کے چلے گئے تھے جیسے قبیلہ طئی، کندہ اور تنوخ۔ کہتے ہیں کہ شمال کی یہ عدنانی زبان اپنی اصل زبان سامی سے، دوسری زبانوں کے مقابلے میں، بہت قریب تھی۔ کیونکہ ان عدنانی قبائل کا دوسری قوموں سے بہت کم میل جول ہوا۔ اسی طرح یہ قبائل دوسری سامی قوموں جیسے عبرانی، بابلی، اور اشوری کی طرح دوسری قوموں کے کبھی غلام نہیں رہے، کیونکہ صحرا میں رہنے کی وجہ سے حملہ آوروں کی دست برد سے یہ ہمیشہ محفوظ رہے۔

جنوبی اور شمالی عربی زبانوں میں اختلاف کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ان میں آپس میں سرے سے کوئی تعلق رہا ہی نہیں تھا، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ جب یمن میں عرم کا سیلاب آیا اور اس کی وجہ سے تاریخ قدیم کا مشہور بند ''مارب'' ٹوٹا، اور ملک کے شہروں اور گانووں کو اس سیلاب نے تباہ و برباد کر دیا تو سبا کے قبائل نے وہاں سے ہجرت کر کے جزیرہ عرب میں پناہ لی۔ یمن کے یہ لوگ متمدن، طاقتور اور ذہین و زیرک تھے، چنانچہ انھوں نے شمال میں آ کر کوشش کی کہ جس طرح یمن میں عدنانی ان کے تابع تھے، اسی طرح یہاں بھی ان کے زیر نگیں رہیں، مگر ان کو اپنی اس کوشش میں کامیابی نہیں ہوئی، کیونکہ عدنانیوں کا پورے صحرا پر قبضہ تھا اور یہاں ان کی حیثیت کافی مضبوط تھی۔ ایک دوسرے پر غلبہ اور بالادستی حاصل کرنے کی یہ کوشش بعد میں تعلقات قائم کرنے اور میل ملاپ بڑھانے کا ذریعہ بن گئی۔ چنانچہ رفتہ رفتہ دونوں گروہوں میں سیاسی اور تجارتی تعلقات قائم ہو گئے اور اس طرح دونوں میں غیر شعوری طور پر الفاظ اور طریقہ ادا کا لین دین بھی ہونے لگا اور زمانے کے ساتھ ساتھ دونوں زبانوں میں یکسانیت کی سی کیفیت پیدا ہونے لگی۔ یہ کشمکش چھٹی صدی عیسوی تک قائم رہی، یہاں تک کہ یمن میں حمیری حکومت کا زور رفتہ رفتہ، کبھی ایرانی اقتدار کی وجہ سے اور کبھی حبشیوں کے تسلط کی وجہ سے کم ہوتا گیا۔ ادھر عدنانیوں کی حالت ان کے برعکس پہلے سے بہت اچھی ہوتی گئی۔ یہ لوگ بازاروں اور میلوں ٹھیلوں میں شریک ہوتے تھے، حج بیت اللہ کی سربراہی ان کو حاصل تھی اس کے علاوہ یہ لوگ حمیری اور ایرانی حکومتوں سے نبرد آزمائی کے لیے تیار رہتے تھے۔ پھر تجارت کی وجہ سے آس پاس کے ملکوں سے تعلقات استوار تھے۔ چنانچہ انھوں نے موقعہ پا کر، اپنی زبان و ادب کو تباہ شدہ اور خستہ و مغلوب حمیریوں پر تھوپ دیا۔ اکھاڑ پچھاڑ اور بناؤ بگاڑ کا یہ دور ابھی چل ہی رہا تھا کہ اسلام آ گیا اور اس کی وجہ سے رہی سہی کسر بھی پوری ہو گئی اور ایک وقت ایسا آیا کہ یمنی لہجہ اور یمنی قوت بالکل ختم ہو گئی، کیونکہ قرآن کے قریشی لہجہ میں اترنے کی وجہ سے اس لہجہ کو دوسرے تمام لہجوں پر فوقیت حاصل ہو گئی۔ چنانچہ دوسری تمام زبانیں اور لہجے ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی، اور اب صرف لہجہ قریش کی حکمرانی اور اس کا غلبہ ہو گیا، جو قرآن کی وجہ سے اب تک جاری ہے۔ (ص)

قریش کی زبان کو غلبہ حاصل ہونے میں جہاں اسلام اور قرآن کے نزول کا دخل ہے، وہاں بعض دوسرے اسباب بھی ہیں جنھوں نے اس فوقیت کو قائم اور برقرار رکھنے میں مدد کی۔ (5) ان میں سے بعض درج ذیل ہیں:

میلے اور بازار

عربوں کا دستور تھا کہ سال کے خاص مہینوں میں، جن میں عام طور سے لڑائی جھگڑا لوٹ مار بند رہتی تھی، خاص قسم کے میلے، بازار لگاتے اور تہواروں کی طرح انھیں مناتے، اور اپنا سامان تجارت بیچتے اور ضرورت کی چیزیں خریدتے۔ ان میلوں اور بازاروں میں جمع ہونے کے بعد، صرف مال تجارت کا ہی لین دین نہیں ہوتا تھا بلکہ زبان و لغت، افکار و خیالات، کا بھی لین دین ہوتا تھا۔ کیونکہ ان میلوں میں عرب کے ممتاز شعرا، خطبا، روسا بڑی شخصیتیں اور قابل قدر لوگ جمع ہوتے تھے۔ جب اس قسم کا اجتماع کہیں ہونے لگے، اور خاص طور سے عرب جیسی قوم کے افراد کا، تو ظاہر ہے اپنی اور اپنے قبیلے کے اہم واقعات، بہادری کے قصے، حسب نسب میں برتری کے دعوے، زبان دانی اور اس میں تفوق کے مظاہرے بھی ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان میلوں میں یہ سب کچھ ہوتا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ تجارتی منڈیاں، جن کی حیثیت ''انٹر عرب نمائشوں'' کی سی تھی، ایک طرف شعرا و خطبا کے افکار و خیالات کی نشرگاہیں بننے لگیں تو دوسری طرف عربوں کو اپنے دین، اخلاق، عادات و اطوار اور اپنی زبان میں اتحاد پیدا کرنے کا موقع بھی ملنے لگا۔

ان میلوں کی سب سے بڑی اور اہم مجلس، ''محفل مشاعرہ ہوتی تھی، جس میں کلام سنانے کے لیے شعرا بہت پہلے سے اور بڑی ریاض کر کے تیاری کرتے تھے۔ عام دستور تھا کہ کسی سن رسیدہ باوقار اور متفق علیہ شاعر کو ثالث یا ''میر مشاعرہ'' مقرر کیا جاتا۔ پھر شعرا اپنا کلام پڑھ کر سناتے اور لوگ سن کر سر دھنتے اور جب سب شعرا فارغ ہو جاتے تو ثالث یا میر مشاعرہ اپنا فیصلہ سناتا کہ اس سال کس شاعر کا قصیدہ سب سے اچھا رہا، چنانچہ اس قصیدہ کو لکھ کر خانہ کعبہ کے دروازہ پر لٹکا دیا جاتا۔ یہی وہ قصیدے ہیں جن کو ''معلقات'' (لٹکائے ہوئے قصیدے) کہتے ہیں۔ عکاظ کے میلہ میں عام طور سے مشہور جاہلی شاعر ''النابغہ

الذبیانی'' مشاعروں کا میر یا ثالث مقرر ہوتا تھا۔ اس کے لیے چمڑے کا ایک خاص قسم کا سرخ رنگ کا خیمہ لگایا جاتا جہاں وہ بڑی عزت و احترام سے قیام کرتا تھا۔ مشاعروں کے علاوہ شعرا نجی طور پر بھی اس کو اپنا کلام دکھا کر اس کی رائے معلوم کرتے تھے۔

ان میلوں میں سنایا ہوا کلام عربوں کے مختلف قبائل میں پھیل کر بہت جلد عام ہو جاتا۔ نشر و اشاعت کے اس عوامی طریقہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ مختلف لہجوں، مروجہ افکار، پڑھے لکھے طبقے کے خیالات، اسلوب بیان اور طریقہ ادا میں رفتہ رفتہ ہم آہنگی اور تال میل پیدا ہونا شروع ہوا جس کی وجہ سے ایک مربوط گشتی ہوئی اور شستہ زبان پیدا ہوگئی جو سب کا مشترک سرمایہ بن گئی۔

یوں تو اس قسم کے کئی میلے لگتے تھے[6] جن میں بعض کی حیثیت بالکل مقامی کی سی تھی، لیکن ان میں سب سے مشہور اور انٹر عرب حیثیت کے میلے تین تھے:

1. عکاظ
2. مجنہ
3. ذوالمجاز

عکاظ نخلہ اور طائف کے درمیان اور مکہ سے تین منزل کی دوری پر ایک گاؤں تھا، اس جگہ میلہ لگنے کا رواج 540ء سے شروع ہوا[7] اور اسلام کے بعد تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ آخر میں خوارج کی لوٹ مار کی وجہ سے 129ھ سے اس کا سلسلہ ختم ہو گیا۔

مجنہ مجنتہ (یا مجنہ) کے قریب ایک بستی تھی۔

ذوالمجاز میدان عرفات سے ایک فرسنگ کے فاصلے پر ایک بازار تھا۔

مجالس ادب اور چوپالیں

میلوں ٹھیلوں کے علاوہ عربوں نے بعض بیٹھکیں بھی بنا رکھی تھیں، جن میں عام سماجی مسائل پر غور و خوض کے علاوہ ادبی نشستیں بھی ہوتی تھیں، ان میں شعرا اپنا کلام سناتے اور بڑے بوڑھے مسائل اور معاملات پر اپنی رائے دیتے اور فیصلہ کرتے۔ ان بیٹھکوں میں مشہور'' نادی قریش'' اور'' دار الندوہ'' تھیں جو کعبہ شریف کے سامنے واقع تھیں۔ ان کے علاوہ محلوں میں امرا کے گھروں کے سامنے خاص بیٹھکیں بھی ہوتی تھیں جہاں روزمرہ کے مسائل اور معاملات پر تبادلۂ خیال ہوتا تھا۔ بادیوں میں بھی ان مجالس اور بیٹھکوں کا رواج تھا، جہاں لوگ جمع ہو کر اپنے مسائل پر غور و خوض کرنے کے علاوہ شعر و شاعری اور حسب نسب پر مفاخرہ کرتے تھے۔

مکہ کی مرکزیت

ان میلوں ٹھیلوں اور مجالس نے زبان کو ترقی دینے اور لہجات کے اختلاف کو مٹانے میں جہاں اہم رول ادا کیا ہے، وہاں خود مکہ کی جائے وقوع، اور قریش کی حیثیت نے بھی، اس سلسلے میں اہم کام کیا ہے۔ کیونکہ چھٹی صدی عیسوی کے وسط سے یہ علاقہ ان قافلوں کی پڑاؤ کی جگہ تھی جو ہندوستان اور یمن کا تجارتی مال لے کر جنوب سے آتے تھے۔ مکہ والے ان سے تمام مال خرید کر خود اس مال کو شام اور مصر کے بازاروں میں کھپاتے تھے۔ خانہ کعبہ کی حرمت اور قریش کی بزرگی پر تمام قبائل کے اتفاق نے مکہ کے تجارتی راستے ان کے لیے پرامن بنا دیے تھے۔ چنانچہ قریشی اپنے تجارتی مال سے لدے ہوئے قافلے بخوبی سے لے جاتے تھے۔ بازاروں اور میلوں میں شرکت، ملکوں کی سیاحت، اور تجارتی سفروں نے ان کے کاروباری معلومات میں اضافہ کر دیا تھا۔ عقل اور سمجھ بڑھنے کی وجہ سے، زندگی کے دوسرے مسائل سے بھی دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی پھر مالی حالت بھی سدھر گئی تھی۔ اس کے علاوہ خود مکہ عرب والوں کی ایک تجارتی منڈی بن گیا تھا، جہاں لوگ پاپیادہ اور سواریوں پر چاروں طرف سے آ کر جمع ہوتے تھے تاکہ ارکان حج (بھی) بجا لائیں اور اپنی ضرورت کا سامان (بھی) وہاں سے خرید لائیں۔

قریش کی حیثیت اور سرداری کا اثر

مختلف لہجات کے میل جول اور آپس میں الفاظ و تعبیرات کے لین دین اور انتخاب کرنے میں قریش کی حیثیت اور ان کی سرداری اور برتری کو بھی بڑا دخل ہے۔ خاندان قریش مکہ کا اصلی باشندہ تھا اور حسب نسب میں سب سے اونچا اور وہاں کا مالدار طبقہ۔ انھیں اپنے تمدن، خانہ کعبہ کے انتظام، دیکھ بھال، حج کی قیادت، عکاظ کے بازار پر حکمرانی، جاڑوں میں یمن اور گرمیوں میں شام کی تجارتی سفروں نے تمام عربی قبائل سے ربط و ضبط رکھنے، اور ان سے بخوبی واقف ہونے کا پورا موقع بہم پہنچا دیا تھا۔ چنانچہ وہ ان کی متفرق بولیوں اور لہجوں کو سن کر ان میں غور اور اپنی زبان سے مقابلہ کیا کرتے تھے، جس کی وجہ سے ان میں الفاظ کے پرکھنے کا اچھا خاصا ملکہ پیدا ہو گیا تھا۔ جس کی مدد سے انھوں نے اپنے لیے ایک پیاری اور نہایت شیریں زبان منتخب کر لی تھی، جو الفاظ اور لہجوں کی خامیوں سے پاک و صاف اور نہایت درجہ دلنشیں ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے مواد کے لحاظ سے بھی سب سے زیادہ گراں قدر تھی۔ پھر شعرا و خطبا وغیرہ نے اس زبان کو اپنا کر اس کی ترویج و اشاعت اور ترقی کے راستے ہموار کر دیے اور بعد میں جب قرآن بھی اسی زبان میں اترا تو اس کے کامل غلبہ اور بالادستی میں جو کمی باقی رہ گئی تھی وہ بھی پوری ہو گئی۔

عربی زبان کی امتیازی خصوصیات

کسی زبان کی اہمیت اور مقبولیت کا پیمانہ صرف یہ نہیں ہے کہ اس کا دائرہ عمل زمین کے کتنے لمبے اور چوڑے رقبے پر پھیلا ہوا ہے یا اسے دنیا کی آبادی

میں سے کتنی بڑی اکثریت بولتی اور سمجھتی ہے۔ بلکہ اس کے ساتھ اس کی کسوٹی یہ بھی ہے کہ اس کا دامن کتنا وسیع ہے۔ اس میں کتنی گہرائی اور کتنی گیرائی ہے۔ اس کے نحوی قاعدوں اور گرامر کے اصولوں میں کتنا استحکام، پختگی اور اسی کے ساتھ کتنی وضاحت ہے۔ اس کے الفاظ کتنے شیریں، اس کا پیرایہ بیان کتنا دلکش اور اس کا طریق تلفظ اور صوتی اثرات کتنے موثر اور اس کے سیکھنے سکھانے کے امکانات اور طریقے کتنے سادے اور آسان ہیں۔ جس زبان میں دائرہ عمل کی وسعت اور کثرت استعمال کے ساتھ ساتھ نحوی قاعدے (گرامر) جتنے سائنٹفک، واضح اور مستحکم ہوں گے، جس کے الفاظ جتنے شیریں اور طرز ادا جتنا دلکش اور اسلوب بیان جتنا موثر اور جس کے معانی جتنے عمیق اور گہرے ہوں گے اسی اعتبار سے زبان کی اہمیت، مقبولیت اور کارفرمائی کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اس نقطہ نظر سے اگر ہم عربی زبان کا مطالعہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اس میں یہ تمام خوبیاں پوری طرح موجود ہیں اور اس وجہ سے اسے دنیا کی مروجہ زبانوں میں ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ عربی زبان کی یہی بے مثال خوبیاں اور امتیازی خصوصیات تھیں جن کی وجہ سے سرداران قریش باہر سے آنے والوں عربوں کے کانوں میں قرآن کی بھنک بھی نہ پڑنے دینا چاہتے تھے کہ مبادا اس کی سحر طرازی کی وجہ سے اسلام لے آئیں۔ اس زبان کی یہی خوبیاں اور امتیازی خصوصیات ہیں، جنھوں نے ڈیڑھ ہزار سال سے نہ صرف اسے بول چال کی ایک کثیر الاستعمال زبان کی حیثیت سے قائم رکھا ہے بلکہ ایک ترقی پذیر، وسیع اور دلکش ادبی وفنی زبان کے قالب میں زندہ رکھا ہے اور اس کے بدلنے یا کمزور کرنے کی مختلف کوششوں کے باوجود اس کے اثر ورسوخ اور ہمہ گیری میں کوئی کمی نہیں آئی۔ کیونکہ اس میں زندہ رہنے، ترقی کرنے، زمانے کے ساتھ چلنے اور پھلنے پھولنے کی وہ تمام صلاحیتیں موجود ہیں جو ایک زبان کو زندہ جاوید بنا دیتی ہیں۔

سامی زبانوں کی شاخوں میں عربی زبان سب سے زیادہ سائنٹفک مربوط، منضبط اور اصول وقواعد کے اعتبار سے گٹھی اور منظم زبان ہے جن کی وجہ سے اس میں چند ایسی امتیازی خصوصیات پیدا ہوگئیں جو عام طور سے دوسری زبانوں میں کمیاب ہیں۔ ان خصوصیات میں سے چند درج ذیل ہیں۔

عربی زبان کی گرامر

عربی زبان کو لکھنے بولنے اور اس میں مافی الضمیر کو ادا کرنے کے لیے جو نحوی اور صرفی قاعدے وضع کیے گئے ہیں ان کی بنیاد قرآن وحدیث کے لسانی شواہد خالص عربی قبائل میں مروج طریقوں، اور مستند علما و ادبا کے طریق استعمال پر ہے اور ان کے وضع کرنے میں علمائے لغت نے بڑی کاوش اور دیدہ ریزی سے کام لیا ہے اور مدتوں کی تحقیقی جستجو، جہاں بینی اور غور وفکر کے بعد ان کو آخری شکل دی ہے۔ اس لیے ان میں ایسا استحکام، ایسی پختگی اور تیقن کی شان پیدا ہوگئی ہے کہ تغیر وتبدل، حذف اضافہ کی مطلقاً گنجائش نہیں رہ گئی ہے۔

زبان کے قاعدوں کی امتیازی خصوصیت کی وجہ سے اس کے سیکھنے سکھانے میں بڑی آسانی ہوگئی ہے کیونکہ جو قاعدہ ہے وہ اپنی جگہ اٹل ہے اور اگر کہیں استثنا کی شکل ہوتی ہے تو اس کا ذکر بھی اسی جگہ کر دیا جاتا ہے اور اس قسم کی استثنائی صورتیں بہت کم ہوتی ہیں۔ اس صفت کی وجہ سے ان قاعدوں کو یاد کرکے برتنا بہت آسان ہوگیا ہے۔ یوں تو عربی زبان کے قواعد ایک مستقل فن بن گئے ہیں، لیکن جہاں تک زبان سیکھنے، اس میں دسترس حاصل کرنے اور مافی الضمیر کو ادا کرنے کی ضرورت ہے اس پورے دفتر کو پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے اور نہ اس میں مہارت تامہ حاصل کرنے کی۔ یہ کام تو ان لوگوں کے لیے ضروری ہے جو ''نحو'' کو بحیثیت فن سیکھنا چاہتے ہوں اور ایسے لوگوں کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ عربی زبان کے ادیب یا انشا پرداز بن جائیں۔ زبان کو لکھنے بولنے اور سمجھنے کے لیے ان سب قاعدوں کو نوک زبان کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس کام کے لیے تو چند گنے چنے اور متعین قاعدے یاد کرکے انھیں قلم و زبان پر رواں کر لینا ہی کافی ہے اور تجربہ نے بتایا ہے کہ اس طریقے پر عمل کرکے بعض علما اس ہندوستان میں بھی عربی ادب کے اچھے انشا پرداز اور خطیب بن گئے ہیں۔

عربی زبان کا اعراب

عربی زبان دنیا کی شاید ان چند زبانوں میں سے ایک ہے جن میں الفاظ کی آوازوں کو علامتوں کے ذریعے ظاہر کیا جاتا ہے۔ اور یہ اس زبان کے وسیع، متمدن اور صاف ستھرے ہونے کی دلیل ہے۔ چنانچہ عربی میں الفاظ کے صوتی شکلوں کو لکھ کر نہیں بلکہ چند اشاروں کے ذریعے جنھیں اعراب کہا جاتا ہے، ظاہر کیا جاتا ہے اور اس کے لیے زیر، زبر اور پیش کی علامتوں ایجاد کی گئی ہیں۔ اس طریقہ کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ لکھنے کے حروف کم ہو جاتے ہیں اور اس سے وقت کی بچت ہو جانے کے علاوہ ادبی ذوق اور ملکہ کی پوری طرح آبیاری ہوتی ہے کہ اگر گرامر کے قاعدے اور اصول ذہن نشین ہیں تو عبارت کو پڑھنے اور سمجھنے میں کوئی دشواری نہ ہوگی۔

نزاکت بیان

زبان میں نزاکت کا وجود خواہ وہ لفظی ہو یا معنوی یا ترکیبی، اس کی خوبصورتی اور دل آویزی میں چار چاند لگا دیتی ہے۔ عربی زبان اس نقطہ نظر سے دنیا کی بڑی سامعہ نواز اور دل آویز زبانوں میں سے ہے۔ اس کے حروف تہجی میں ثقیل حروف مثلاً ژ، پھ، چھ، ڈھ، گھ، ڑھ وغیرہ کے نہ ہونے کی وجہ سے اس کے الفاظ بہت شیریں اور سامعہ نواز ہوگئے ہیں۔ غیر زبانوں کے جو الفاظ اس میں مستعار آئے ہیں انھیں عربی ذوق کا ایسا جامہ پہنا دیا گیا ہے کہ معرب

ہو کر وہ بھی عربی زبان کے حسن میں ڈھل کے نکھر گئے ہیں۔ عربی الفاظ کی نزاکت بیانی کا یہ عالم ہے کہ معانی کے جزئیات بھی پوری طرح واضح ہو جاتے ہیں اور کوئی گوشہ تشنہ نہیں رہتا۔ جیسے دن کے ہر گھنٹے اور پہر کے لیے ایک الگ مخصوص نام کا پایا جانا، یا چاندنی رات کے ہر مرحلے کا ایک مخصوص نام۔ اسی طرح بالوں، آنکھوں اور ان کے امراض کے اور اونٹ و گھوڑے کے ذرا سے فرق کے ساتھ الگ نام اور تلوار کے اس کے صفات کے اعتبار سے ایک دوسرے سے بالکل الگ اور امتیازی نام اور تلوار کے اس کے صفات کے اعتبار سے ایک دوسرے سے بالکل الگ اور امتیازی نام۔ اسی طرح اس زبان میں بعض ایسے الفاظ پائے جاتے ہیں جن کے معانی میں اتنی وسعت اور گہرائی ہے کہ اس کا ترجمہ کئی سطروں میں آتا ہے۔ یہی حال مصادر اور ان کے مشتقات کا ہے کہ ایک ہی مصدر کی جڑ سے مختلف معانی دینے والے مختلف قسم کے افعال مشتق ہوتے ہیں۔ چنانچہ افعال میں ایک حرف بڑھا دینے سے یا گھٹا دینے سے معانی بالکل بدل جاتے ہیں۔ جیسے ''طعم'' (کھایا) ''اطعم'' کھلایا۔ اسی طرح صلات کے بدلنے سے افعال کے معنی بالکل بدل جاتے ہیں جیسے ''رغب الی'' (کسی کی طرف مائل ہونا) اور ''رغب عن'' (کسی سے منہ موڑ لینا۔ نفرت کرنا)۔ عربی ادب میں صلات کے علم کو اتنی اہمیت حاصل ہے کہ بعض علما نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ زبان دانی صرف صلات کا علم ہے۔ انسان کے اوصاف اور اس کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کے لیے جو موزوں ترین طریقے اور جو الفاظ عربی زبان میں پائے جاتے ہیں شاید ان کی مثال دوسری زبانوں میں نہ ملے۔ چنانچہ صرف محبت کے جذبات اور اس کے مختلف نازک ترین مراحل کے اظہار کے لیے عربی زبان میں کم سے کم دس الفاظ پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح نفرت و حسد اور بخل و سخاوت اور لالچ اور ان کے مختلف مراحل کے لیے بھی متعدد الفاظ پائے جاتے ہیں۔ جو ان صفات و احساسات کے جزئیات تک کو واضح کر دیتے ہیں۔

اعجاز وایجاز

عام طور سے دنیا کی ہر زبان میں کم الفاظ کے ذریعے بہت معانی پیدا کرنے کا طریقہ رائج ہے جسے اصطلاح میں ''اعجاز'' کہا جاتا ہے۔ عربی زبان اعجاز کے معاملے میں منفرد زبان ہے۔ اس میں بکثرت ایسے الفاظ پائے جاتے ہیں جن کی تشریح کے لیے ایک دفتر چاہیے۔ مثلاً لفظ ''الحمد'' کو لے لیجیے جس سے قرآن کی سورہ فاتحہ شروع ہوتی ہے جس کے معانی علما یہ بتاتے ہیں کہ انعامات و احسانات کے اعتراف کے جذبے کے ساتھ انسان نے شکر ادا کرنے کے جتنے طریقے ایجاد کیے ہیں یا ایجاد کرے گا یا سوچا ہے یا سوچ سکتا ہے وہ سب اس خدائے منعم و محسن کے لیے مخصوص ہیں۔ اس یک لفظ میں ایسی جامعیت اور شمولیت ہے کہ دفتر اس معنی کو ادا کرنے کے لیے ناکافی ہیں۔ اور الفاظ کی یہ صفت جامعیت عربی زبان میں بہت عام ہے۔ بات کو اشاروں کے ذریعے پر لطف بنانے کے لیے کنایہ، مجاز اور اسلوب کو دلنشیں اور موثر بنانے کے لیے معانی و بدیع کا استعمال عربی زبان کی ایک امتیازی خصوصیت ہے۔

مترادفات اور اضداد کا وجود

دنیا کی تقریباً تمام زبانوں میں ایک معنی کے ادا کرنے کے لیے کئی لفظ استعمال کرنے کا طریقہ رائج ہے۔ ان الفاظ کو مترادفات'' یا'' مرادف الفاظ'' کہا جاتا ہے۔ عربی زبان کا دامن مترادفات کے معاملے میں بڑا وسیع ہے۔ چنانچہ علما لغت نے صرف سال کے لیے 24 نام اور روشنی کے لیے 21، تاریکی کے لیے 52، کنویں کے لیے 88، پانی کے لیے 170، شیر کے لیے 350 اور اونٹنی کے لیے 255 نام لکھے ہیں۔ اسی طرح انسانی حلیے کے لیے اور اوصاف کے لیے بھی متعدد الفاظ آتے ہیں۔ چنانچہ عربی میں درازی قد کے لیے 91 الفاظ، پستہ قدی کے لیے 120 الفاظ آئے ہیں۔ اوصاف میں بخل، سخاوت، شرافت، رذالت وغیرہ کے الفاظ کے لیے بھی مختلف الفاظ آئے ہیں۔

الفاظ کے معانی کے اظہار کے سلسلے میں عربی زبان کو دوسری زبان کے مقابلے میں یہ امتیازی خصوصیت حاصل ہے کہ اس میں بعض الفاظ ایسے ہیں جو متضاد معنی دیتے ہیں جیسے ''دون'' کا لفظ ہے کہ اس کے معنی کم، زیادہ، قریب، دور اور آگے پیچھے کے بھی آتے ہیں۔

ایک لفظ سے کئی معانی کا نکالنا

غالباً عربی زبان دنیا کی زبانوں میں اس حیثیت سے بالکل منفرد زبان ہے کہ ایک ہی لفظ بسا اوقات کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ علما لغت نے دو سو سے زائد الفاظ ایسے جمع کیے ہیں جو تین معنوں میں استعمال ہوتے ہیں اور ایک سو سے زائد الفاظ جو چار اور پانچ معنی دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض الفاظ 25 معنی دینے والے بھی ہیں۔ چنانچہ ''فال'' کا لفظ 27 معنی کو ظاہر کرتا ہے اور ''عین'' کا لفظ 25 معنی کو اور ''عجوز'' کا لفظ 60 معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

حکم و امثال کا وجود

کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معانی کو دلنشیں انداز میں ظاہر کرنے کا طریقہ کم و بیش ہر زبان میں پایا جاتا ہے جسے مثل یا کہاوت کہتے ہیں۔ مگر عربی زبان میں اس کی بہت کثرت اور اس میں بڑا متنوع ہے۔ عربوں کو اپنے مخصوص

طرز زندگی کی وجہ سے عناصر فطرت سے براہ راست مقابلہ کرنا پڑتا تھا۔ اس طرز زندگی کے تجربات سے عربوں نے براہ راست نتائج اخذ کیے۔ ان نتائج کو حکمت وفلسفہ، دانشمندی و جزرسی کی آمیزش سے الفاظ کے ایسے خوبصورت قالب میں ڈھالا گیا جو صوتی اثرات کے حسن و جمال کے علاوہ معنویت میں بھی ایک بھرپیکر اس تھے اور یہی قالب ''ضرب الامثال'' یا کہاوتیں کہلائیں۔

ان اہم اور امتیازی خصوصیات کے علاوہ عربی زبان میں ''سجع'' یعنی مقفی اور مرصع نثر کا طریقہ بھی رائج تھا جسے عام طور سے اسلام سے پہلے پروہت (کہان) اور مقررین بھی استعمال کرتے تھے۔

الفاظ کے صوتی اثرات کے ذریعے منظرکشی کرنے میں عربی زبان کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ چنانچہ اس زبان میں بعض ادبا ایسے گزرے ہیں جنھوں نے الفاظ کے ذریعے کسی چیز کا ایسا نقشہ کھینچ دیا کہ اس کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر گئی۔ جیسے ابوزید الطائی نے حضرت عثمان کے سامنے شیر کا حملہ اس طرح بیان کیا کہ اس کا مہیب تصور آنکھوں کے سامنے آ گیا۔(7)

غرض یہ کہ عربی زبان ان گوناگوں امتیازی خصوصیات کی وجہ سے مختلف زمانوں کے نشیب وفراز سے گزرتی ہوئی، مختلف ملکوں اور قوموں سے تعلق پیدا کرتی ہوئی، کبھی ان سے چھٹتی ہوئی، کبھی ان سے جڑتی ہوئی نہ صرف آج تک باقی ہے بلکہ روز بروز ترقی کر رہی ہے اور اپنا دائرۂ اثر وعمل بڑھا رہی ہے۔

عربی ادب کی مختلف ادوار میں تقسیم

عربی ادب، تاریخ کے مختلف مراحل اور زمانے کے مختلف نشیب وفراز سے گزر کر موجودہ صورت کو پہنچا ہے۔ جنھوں نے اسے ترقی دینے، مستحکم کرنے اور دوام بخشنے میں بہت اہم رول ادا کیا ہے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کی پوری تاریخ کو ان مراحل اور ادوار میں تقسیم کر دیا جائے جن سے گزرتا ہوا اس نے اپنی موجودہ شکل اختیار کی ہے۔ تاکہ مطالعہ میں آسانی ہو اور نتائج کے اخذ کرنے میں اسباب وعلل کے تانے بانے کے ڈھیلے پڑ جانے یا مخلوط ہو جانے کی وجہ سے غلطی نہ ہونے پائے۔

1. زمانہ جاہلیت:

اس زمانے کو دو دوروں میں تقسیم کیا جاتا ہے:

پہلا دور: پانچویں صدی عیسوی سے پہلے کا زمانہ یعنی الجاہلیۃ الاولیٰ (پہلا جاہلی زمانہ)

دوسرا دور: پانچویں صدی عیسوی کے بعد سے 23-622 تک یعنی ظہور اسلام سے تقریباً ڈیڑھ سو سال پہلے شروع ہوتا ہے اور ہجرت نبوی پر یعنی 23-622 پر ختم ہوتا ہے۔

2. اسلامی زمانہ:

اس زمانے کے بھی دو دور ہیں۔

پہلا دور: صدر اسلام

یہ دور آنحضرت کی ہجرت سے شروع ہوکر آخری خلیفہ حضرت علیؓ کے دور تک رہتا ہے یعنی 1ھ سے 40ھ مطابق 23-622 سے 62-661 تک

دوسرا دور: عہد بنی امیہ

یہ دور حضرت معاویہ کی خلافت سے شروع ہوکر عباسی سلطنت کے قیام یعنی 41ھ سے 132ھ مطابق 62-661 سے 750ء تک رہتا ہے۔

3. عباسی زمانہ:

اس زمانے کو بھی دو دوروں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

پہلا دور (ترقی وعروج کا زمانہ) 132ھ سے 332ھ مطابق 750ء سے 946ء تک۔

دوسرا دور (طوائف الملوکی کا زمانہ) 332ھ سے 656 مطابق 946ء سے 1258ء تک (زوال بغداد)

4. عثمانی زمانہ یا عہد تنزل وانحطاط:

یہ زمانہ 656ھ سے 1220ھ مطابق 1258ء سے 1797ء تک رہتا ہے۔

5. عبوری زمانہ:

یہ زمانہ نپولین کے مصر پر قبضہ 1798ء اور اس کے بعد محمد علی پاشا کے برسر اقتدار آنے یعنی 1801 سے شروع ہوکر 1919 پر ختم ہوتا ہے۔

6. موجودہ زمانہ:

1920ء سے شروع ہوکر اب تک چل رہا ہے۔

حواشی:

1. یہ لوگ ''م'' کو بدل کر ''ب'' کر دیتے تھے اور ''ب'' کو بدل کر ''م'' کر دیتے تھے چنانچہ ''ما اسمک'' کی جگہ ''با اسمک'' اور ''بکر'' کی جگہ ''مکر'' بولتے تھے۔
2. یہ لوگ ''من'' حرف جار کے ''نون'' کو حذف کر دیتے تھے اور ''خرجت من البیت'' کی جگہ ''خرجت ملبیت'' کہتے تھے۔ آج بھی مصر اور لبنان میں اکثر جگہ اسی طرح بولتے ہیں۔
3. عجعجہ یہ ہے کہ اگر کسی لفظ میں ''عین'' کے بعد ''ی'' آ جائے تو اس کو ''ج'' سے بدل دیا جائے جیسے ''راعی'' کو ''راعج'' اور ''کرسی'' کو ''کرسج'' کہا جائے۔ چنانچہ ''الراعی خرج معی'' کو قضاعہ والے ''الراعج خرج معج'' کہتے تھے۔ ''طمطمانیہ''، ''ال'' کی جگہ ''ام'' بولنے کو کہتے ہیں جیسے ''البر'' کو ''امبر''، ''الصیام'' کو ''امصیام'' یا ''طاب الہواء'' کی جگہ ''طاب امہوا'' کہنا۔ ''ح'' کی جگہ ''ع'' بولنے کو ''فحفحہ'' کہتے ہیں جیسے ''احل اللہ الحلال'' کو ''اعل اللہ العلال'' کہا جائے یا ''الحسن'' کو ''العسن'' کہا جائے۔ ''عنعنہ'' میں شروع لفظ کے ہمزہ کو ''عین'' سے بدل دیتے تھے جیسے ''أمان'' کو ''عمان''، ''ان''

کو "عن" کہتے تھے۔ "کشکشہ" یہ ہے کہ مؤنث حاضر کے "ک" کو "ش" سے بدل دیا جائے اور "علیک" کی جگہ "علیش" کہا جائے یا "ک" کے بعد "ش" بڑھا دیا جائے اور "علیک" کی جگہ "علیکش" بولا جائے۔ "قطعہ" کسی لفظ کے آخری حرف کو حذف کر دینے کا نام ہے، جیسے "یا ابالحسن" کو "یا ابالحسا" کہا جائے۔

4. یمنی قبائل کی اس حادثہ اور ان کے آپس کے جنگ و جدال کی وجہ سے تتر بتر ہو جانے کا واقعہ اتنا مؤثر ہے کہ عربی ادب میں یہ حادثہ ضرب المثل بن گیا، چنانچہ کہتے ہیں کہ تفرقوا أیدی سبا یعنی ایسے تتر بتر ہوئے جیسے سبا کے قبائل۔

(ص) قریش کے لہجہ کی فوقیت کے اسباب وعلل کے لیے ملاحظہ کیجیے: مضمون "مقدمہ تاج العروس" دراستہ نقدیہ۔ از ڈاکٹر محمد عبدالسلام، شرف الدین، نجیر یا۔ مطبوعہ "اللسان العربی" الرباط، مراکش۔ المجلد الثالث عشر عام 1396ھ/ 1976۔ صفر 136 "قریش واللغتہ المشترکہ"

5. سامی زبانوں سے متعلق تفصیلات کے لیے ملاحظہ کیجیے: (1) "فقہ اللغتہ" مولفہ دکتور علی عبدالواحد وافی۔ (2) "علم اللغتہ" مؤلفہ مصنف مذکور: مطبوعہ لجنتہ البیان العربی، المنیر ہ، القاہرہ 1962ء 1381ھ۔ (3) تاریخ العرب قبل الاسلام، الدکتور جواد علی 7,6% مطبعتہ المجمع العلمی العراقی۔ (4) فقہ اللغتہ وخصائص العربیہ: محمد المبارک مطبوعہ دار الفکر الحدیث لبنان۔ (5) الفلسفتہ اللغویتہ: جرجی زیدان، مطبوعہ الہلال۔ مصر 1904ء۔ (6) نشو اللغتہ العربیتہ ونموھا واکمالھا: مطبوعہ القاہرہ 1938ء۔ (7) مقدمتہ لدراستہ لغتہ العرب: عبداللہ العلایلی۔ مطبوعہ القاہرہ۔ (8) من اسرار العربیتہ: ڈاکٹر ابراہیم انیس، مطبوعہ قاہرہ 1950ء۔ (9) دراسات فی العربیتہ وتاریخھا: محمد الخضر حسین، مطبوعہ دمشق 1960ء۔ (10) اللغتہ الشاعرہ: عباس محمود العقاد، مطبوعہ قاہرہ۔ (11) مشکلات اللغتہ العربیتہ: محمود تیمور، قاہرہ (12) دراسات فی فقہ اللغتہ: ڈاکٹر صبحی الصالح، دمشق 1960ء۔ (13) دراسات فی اللغتہ: ڈاکٹر ابراہیم السامرائی، بغداد 1961ء۔

8. جیسے "دومتہ الجندل" کا میلہ جو کیم ربیع الاول سے شروع ہوتا تھا۔ یا ہجر، عمان، حضرموت، عدن اور صقار کے میلے، جن کے بعد عکاظ کا میلہ شروع ہوتا تھا۔ عکاظ کے میلہ کی تاریخ بعض مورخین نے عام الفیل کے پندرہ سال بعد بتائی ہے، اس حساب سے 571ء تاریخ نکلتی ہے۔

7. عبارتوں کے لیے جرجی زیدان: تاریخ آداب اللغتہ العربیتہ۔ ج اصف 55۔ ملاحظہ کیجیے۔ ضرب الامثال کے لیے دیکھیے: فجر الاسلام۔ احمد امین۔ الفن و مذاہبہ: ڈاکٹر شوقی ضیف۔ الامثال فی النثر العربی القدیم۔ عبدالمجید عابدین۔ لفظ "مثل" دائرۃ المعارف الاسلامیہ۔

□□□

دیوان درد

مرتب: ڈاکٹر نسیم احمد

خواجہ میر درد اردو کے صرف صوفی شاعر ہی نہیں بلکہ ان کی غزلیہ شاعری غزل کی اس توانا روایت کا حصہ ہے جس کی نمائندگی اعلیٰ سطح پر میر تقی میر کر رہے تھے لیکن افسوس کہ درد کی وفات کے بہت بعد ان کے کلام کی اشاعت ہو پائی اور وہ بھی اختلافات متن کے ساتھ۔ ہندوپاک میں "انتخاب کلام درد" اور "دیوان درد" کے انھی متعدد مطبوعہ وغیر مطبوعہ نسخوں کے پیش نظر ڈاکٹر نسیم احمد نے "دیوان درد" کا یہ نسخہ ترتیب دیا ہے اور اس کی تفصیلی وضاحت مقدمے میں کر دی ہے۔

صفحات: 336، قیمت: -/160 روپے

اردو مرثیے میں ہیئت اور موضوع کے تجربات

مصنف: شمشاد حیدر زیدی

اردو شاعری میں مرثیے کی جو اہمیت ہے اور اس نے اظہار و اسلوب اور موضوعات کے دائرے کو جو وسعت دی ہے اس کے سبھی معترف او رمدّاح ہیں۔ لیکن یہ بھی ہوا کہ مرثیے کی مذہبی حیثیت کو زیادہ اہمیت دی گئی اور ادبی قدر و قیمت پر کم توجہ کی گئی۔ شاید ایسا اس لیے ہوا کہ مرثیے پر لکھنے کے لیے قرآن، احادیث، تاریخ اور اسلامی روایات سے مکمل آگاہی ضروری ہے۔ اس کتاب میں مرثیہ گوئی کے آغاز سے موجودہ دور تک کے مرثیوں کا ادبی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا گیا ہے۔

صفحات: 344، قیمت -/227 روپے

حبیب حق

(ہماری مطبوعات سے)

تصوّر اور حقیقت

فنونِ لطیفہ کی دیوی نہ صرف لوگوں کو بذاتِ خود تخلیقی تحریک دیتی ہے، بلکہ اُن کے ذریعے دوسرے بھی تخلیقی جوش میں آن کر ایک رسّی سے بندھ جاتے ہیں...... سارے بہترین شاعر جو رزمیہ نظمیں لکھتے ہیں وہ فن کا استعمال نہیں کرتے، بلکہ جب وہ ان میں دلکش نظموں کی تخلیق کرتے ہیں، تو وجدان میں ہوتے ہیں، اور الہامی کیفیت ان پر طاری رہا کرتی ہے، اور یہی حال اچھے غنائی شعرا کا بھی ہوتا ہے...... ان کے حواس مختل ہو جاتے ہیں...... ان پر مجنونیت اور پاگل پن کا دورہ چڑھ جاتا ہے...... جب وہ عقل کے زیرِ اثر رہتا ہے (تو) نہ تو شعر کہہ سکتا ہے، اور نہ غیب کی باتیں بتا سکتا ہے...... ربّانی عنایات کی وجہ سے ایسا (یعنی شاعری) ظہور میں آتا ہے...... دیوتا ان شاعروں کے اذہان پر قبضہ کر لیتا ہے، اور انھیں خدمت گاروں کی طرح استعمال کرتا ہے، اور یہی عالم ان کے ساتھ بھی ہوتا ہے جو غیب داں ہوتے ہیں...... وہ نہیں سناتے ہیں...... بلکہ دیوتا خود سنا رہا ہے......

فلاطوں

یونانیوں کے یہاں شاعری جس کی ابتدا مائی سینی عہد میں ہوئی، اور کئی سو سال بعد جب تحریر کی ابتدا ہوئی تو انھیں محفوظ کرنے کی کوشش کی گئی۔ محض رسوم کے انعقاد کے موقعوں لیے، یا گہرے مذہبی احساسات تک محدود نہیں رہی، بلکہ عام زندگی کا ناقابلِ تفریق حصہ بن کر رہ گئی۔ یہ ایک آلہ تھا، جس کے ذریعے لوگوں نے اپنے آبا و اجداد کے قدیم کارناموں کو یاد رکھا۔ اس کی ضرورت عوامی تیوہاروں میں محسوس کی گئی۔ اسے گھریلو معاملات میں کام میں لایا گیا۔ ایک طریقۂ کار تھا جس کے ذریعے یونانیوں نے اپنی امیدوں، اور اپنی دشواریوں کی تشہیر کی۔ فنی اعتبار سے ان کی شاعری نثر سے بہت پرانی تھی۔ اس نے اپنے عروج کے دوران یونانیوں کے حسّی مزاج کو مستقل طور پر ایک مخصوص روپ دے دیا۔ اپنی شاعری کی بدولت وہ بآسانی پہچانے جا سکتے ہیں۔

قدیم سماج میں شاعر ایک خارجی قوت کے ہاتھوں میں ایک آلہ تسلیم کیا گیا، جس کے ذریعے قوت اپنی زبان بولتی ہے۔ شاعر ایک پیغام بر ہے، ایک ناقل ہے، نامعلوم، نہ سمجھنے والی قوتوں کا ہرکارہ ہے۔ ہو الہام پر انحصار کرتا ہے۔ شاعر ہیسیوڈ نے دعویٰ کیا تھا کہ اسے ان ساری اشیا کا علم تھا جو موجود ہیں، اور موجود ہوں گی۔ یونانی مانتے تھے کہ شاعری ایک الہامی حرکت ہے۔ فلاطوں ''فیڈرس'' میں تسلیم کرتا ہے کہ سارے شاعر کسی نہ کسی صورت میں جذب کے تحت ہوتے ہیں۔ شاعر کہا کرتے تھے کہ ایک سماوی قوت، یعنی میوز، یعنی شاعری کی دیوی، ان کے فن کی نگہبانی کیا کرتی تھی۔ ہومر نے اس دیوی سے مناجات کی تھی کہ ''ایلیڈ'' نظم کرنے میں مدد کرے۔ ہیسیوڈ نے خود میوز کو پہاڑ پر نغمہ سرا سنا تھا۔ اس کی ''تھیوگنی'' (''دیوتاؤں کی پیدائش'') پھر وجود میں آئی تھی۔ پنڈار میوز سے ملتجی رہا کہ وہ اس کی نظموں کی لے اور آہنگ کو سنوارے۔ شاعر چیزے دگر تھا۔

یہ نظریہ کہ شاعری الہامِ ربّانی کا نتیجہ ہے، دوسرے نظریے کی عین ضد ہے۔ اور جو کہ یونان میں اتنا ہی مقبول تھا۔ کہ شاعری فن یا ایک قسم کا پیشہ ہے۔ اس پیشے کو، دیگر پیشوں کی مانند، استعمال سے بہتر بنایا جا سکتا تھا۔ الفاظ جو شاعری کے متعلق استعمال کیے گئے ان میں اہم ''پوسے سس'' ہے جس کے معنی ''بنانے'' کے ہیں۔ شاعری کی مختلف قسموں کے لیے مختلف الفاظ استعمال کیے جاتے تھے جیسے ''رزمیہ'' کے لیے ''ایپوس'' گیت کے لیے ''اومیڈے''۔ کوئی واحد لفظ وجود میں نہ آیا جو کہ ان سارے مضامین یا اصناف کا احاطہ کر لیتا۔ اگر یونانی ان سبھوں کو ایک ساتھ ملا کر کچھ اظہار کرنا چاہتے ہوں، تو وہ لفظ ''سوفیا'' کا استعمال کرتے تھے، جس کے معنی ''دانش'' یا محض ''مہارت'' کے بھی ہیں۔ اس لفظ کو سارے فنون کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ یعنی شاعری، سنگ سازی، کشیدہ کاری، مصوّری وغیرہ۔ پیشوں کے لیے بھی استعمال میں لایا جاتا تھا، جو کہ تکنیکی پیشے تھے، جیسے کہ جہاز سازی اور تعمیر سازی، اور سالارِ فوج اور باورچیوں کے لیے بھی۔ سارے پیشے، ان کے ہاں محض ''دانش وری'' کے مختلف روپ نہیں تھے۔ بلکہ تکنیکی مہارت کی مختلف شکلیں تھیں۔ پنڈار خود کو ''ماہر پیشہ ور'' کہتا ہے۔ لیکن پیشہ ورانہ مہارت کا یہ نظریہ زیادہ تر مقبول نہ ہو سکا۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ پنڈار اور ایسکی لیز کی شاعری کے مخصوص اعلیٰ حصے محض مہارت کا نتیجہ ہیں۔ شاعر تلمیذ الرحمٰن ہوا کرتے تھے، اور ان کے ہاں ''آمد'' اور ''آورد'' کا مسئلہ بھی موجود رہا تھا۔

شاعری سے متعلق دو متضاد طریقے دراصل ایک ہی شے کو دو مختلف

'کلاسیکی یونان: تہذیب، فلسفہ، فنون لطیفہ'' سے ماخوذ، مصنف: حبیب حق، صفحات۔ 248، قیمت : -/127

نوٹ : قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔

طریقوں سے دیکھنے کی کوشش تھی۔ شعری تخلیق کے دوران وجدان اور تکنیکی صلاحیت دونوں کی ضرورت تھی۔ تکنیکی مہارت پر انھیں ناز تھا۔ مزید برآں، ہر ایک فن کے لیے ایک مخصوص دیوتا، یا دیوی موجود تھی۔ یہ ربانی ہستیاں شاعروں کی تکنیکی مہارت کی بدولت اُسے شعر تخلیق کرنے کی صلاحیتیں بخشتی ہیں۔ انھوں نے ان متضاد نظریوں کو یک جا سمیٹ کر ایک عظیم عمارت تعمیر کی۔ شاعری محض چند پُر اسرار تجربات و واردات تک محدود ہو کر نہیں رہ گئی۔ اس نے ذہن انسانی کے سارے پھیلے ہوئے وسیع علاقے کا جائزہ لیا، اور حسیات کو بھی سمجھا۔ محض حظ کی خاطر نہیں تھی، انبساط کے سرچشموں کے قریب لے جاتی تھی، جہاں پہنچ کر انسانی ہستی وجود کامل تک پہنچ سکتی ہے۔

فن کا اولیں کام یہ رہا کہ گزرتے لمحے کو ابدیت بخشی جائے۔ موت کو، مثلاً اس طرح پرے رکھا جائے کہ کسی خیالی شے کی تخلیق کر لی جائے جنھیں وقت برباد نہیں کرسکتا ہے۔ شاعری، ان کے پیکرات، تصورات، لفظیات انھیں دیوتاؤں کی بھرپور آفاقیت میں جذب ہونے کی گوناگوں کیفیت عطا کرتی تھی۔

شاعری کے حسی اور جذباتی اثرات کی بابت یونانیوں نے اپنے دریافت شدہ حُسن یا خوبصورتی کے نظریے کو استعمال کیا حُسن کی تعریف کرنی دشوار تھی، لیکن یونانیوں کا ایقان تھا کہ وہ جب بھی حُسن کا مشاہدہ کریں گے تو اُسے جان جائیں گے، اس سے اثر پذیر ہوں گے، اور یہ کہ: حُسن کے بغیر شاعری کا کوئی مقصد نہیں ہے۔ حُسن، چنانچہ، ایک ''شے'' تھی جو کہ اشیا کی صفات میں شامل تھی، ایک قسم کی ''ودیعی'' یا ''جبلتی'' حس تھی، ایک آفاقی شے جو کہ اشیا کا مستقل حصہ تھی۔ یہ ایک آفاقی حقیقت تھی جسے کہ شاعری اور فن کار اُبھارتے اور واضح کیا کرتے تھے، اور ہر کوئی اُسے محسوس کرسکتا تھا، جس کے پاس دیکھنے کے لیے آنکھیں اور سننے کے لیے کان تھے۔ ایسی پُر اسرار قوت بذاتِ خود وجود رکھتی تھی، جس کا دفعتاً الہام ہو جایا کرتا تھا۔ شاعر کا کام تھا کہ اُس حُسن کی جستجو کرے جو کہ اشیا میں مضمر ہیں۔

''حسین'' یا خوبصورت ہر وہ شے تھی جو وارفتہ ہونے دے، اور حواس کو گرفتار رکھے۔ حسین اشیا کی بدولت ایک عجیب و غریب الہامی کیفیت ظہور میں آجاتی تھی، اور شاعروں کو نوازی جاتی تھی۔

یونانی شاعری اپنی بحر، یعنی میٹر، کی وجہ سے اتنی جان دار اور عظیم ہوئی۔ یونانی میں جتنی بحریں ایجاد کی گئیں غالباً کہیں نہیں کی گئیں۔ یہ بحریں ''زور'' پر قائم نہیں ہوئیں بلکہ ''وزن'' پر یعنی جو کہ خارج کی ہوئی آواز، یا تان، اکائیوں پر قائم ہیں۔ الفاظ کے ٹکڑوں کا میزان آوازوں کے اُتار چڑھاؤ پر قائم نہیں۔ انھیں ادا کرنا سراسر وزن کی بدولت ہے۔ یعنی کہ کتنا وقت لگتا ہے کہ ایک ٹکڑے کو ادا کیا جائے۔ معمولی سے معمولی بحروں میں (جیسے کہ ہیکزامیٹر) اس امر کا قطعی خیال رکھا گیا ہے، اور جس کی وجہ سے اشعار ایک قاعدے اور اصول پر منضبط ہوتے ہیں۔ یونانی الفاظ کے اوزان طے شدہ ہیں، اور ساتھ ساتھ الفاظ کے ٹکڑوں کی تقسیم طویل اور مختصر اوزان میں بھی طے ہے۔ لیکن ہم غیر یونانی اس ''آواز'' (ایکسینٹ) کو پوری طرح سمجھنے سے قاصر ہیں۔ یونانی غنائی بحروں کا دارومدار، اور ان کی یہ صلاحیت کہ نئے فارم کو قبول کرلیں، بہت حد تک رقص اور موسیقی پر منحصر کرتا تھا۔ ''ہیسٹیمزا'' کی گمبھیرتا بتاتی ہے کہ اس ''مرکب'' میں رقص اور موسیقی اتنا ہی اہم رول ادا کرتے تھے، جتنے کہ الفاظ رقص کی ''تھاپ'' یا ''گت''، اور موسیقی کی ''تان'' یا ''لے'' انتہائی اہم تھیں۔ یوں غنائی بحروں نے ان امتزاج کی بدولت جنم لیا۔

ان تکنیکی سہاروں کے ذریعے یونانی شعرا اس بات کے لیے تیار رہا کرتے تھے کہ وہ کسی بھی موضوع پر شاعری کے ذریعے اپنے خیالوں کا اظہار کرسکتے تھے۔ ہر قسم کے موضوعات پر وہ شاعری کرسکتے تھے۔ ہیسیوڈ ہل پر طبع آزمائی کرتا ہے تو پارمنائی ڈیز ہستی کی وحدت کے دشوار مضمون پر، ایمپے ڈکلیز کی فطرت پر۔ اس بوقلمونی کی خاص وجہ یہ تھی کہ انھوں نے شاعری میں دانش وری کو بہت ہی اعلیٰ مقام عطا کیا۔ اور چونکہ شاعری ایک شعوری حرکت تھی، اس لیے اس میں توانائی آئی۔ انھوں نے زندگی سے متعلق بہت ہی سوچتے ہوئے گہرے، اور سنجیدہ تصورات کو سمویا۔ ایسکی لیز اور سوفوکلیز کی شاعری کو پڑھتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ رسمی باتوں سے پرہیز کرتے ہیں، اپنے تصورات آہستہ آہستہ اپنے کرداروں کے ذریعے عیاں کرتے ہیں۔ ان کے یہاں ضبط و نظم انتہائی لطیف ہے، اور تکنیک پر اُن کی دسترس غیر معمولی، بلکہ عقل اور حیرت میں ڈالنے والی دکھائی دیتی ہے۔

مقصد کی گہری ایمانداری، ایک طرح کی بے لاگی، اور سنجیدہ پن یونانی شاعری کے ''سچے پن'' میں ملتا ہے۔ یونانیوں نے اصرار کیا کہ شاعری کے اندر سچائی کے عناصر ضرور موجود ہوتے ہیں: یہ محض افترا پردازی نہیں۔ ہم بتا نہیں سکتے کہ ہومر اپنی تاریخی کہانیوں کو کتنا درست سمجھتا ہے۔ اور ٹرائے کا میدان تقریباً ویسا ہی ہے جیسا کہ ہومر کے ہاں ہے، اور تھیسکا بھی جیسا کہ اوڈیسی اس نے دیکھا تھا۔ پر وہ کم و بیش یہ جانتے تھے کہ شاعری خود کو مکمل طور پر نہ تو سچائی سے خود کو علیحدہ کرسکتی ہے، اور نہ جھوٹ سے، گو یہ ہمیشہ ایک دوسروں میں فرق نہیں کرسکی۔ پنڈار دعویٰ کرتا ہے کہ اُس کا فرض ہے کہ وہ سچ بولے ارسطو ''شعریات'' میں تاریخ اور شاعری کے مابین فرق کے سلسلے میں اس نتیجے پر پہنچا: فرق اس امر سے ظاہر ہے: ایک (تاریخ) بتاتا ہے کہ کیا ہوا، دوسرا (شاعری) کیا ہوسکتا ہے۔ اس لیے شاعری تاریخ سے کہیں زیادہ فلسفیانہ، اور کہیں زیادہ گہری ہے، کیوں کہ شاعری آفاقی مسائل سے بحث کرتی ہے، اور تاریخ انفرادی امور سے۔ اگر فلسفہ ممکنات پر غور کرنے کا دوسرا نام ہے، تو شاعری کو ایک حد تک فلسفہ کہہ سکتے ہیں، لیکن شاعری لبھاتی اور مسحور کرتی، اور اس لیے دروغ آمیزی کو خود میں شامل کرتی جاتی ہے۔ یونانی، اکثر اس دروغ آمیزی کو حقیقت کا ایک نرالا روپ تسلیم کرتے تھے۔

یونانی ادب کے موضوع انسان ہیں، اور دیوتا۔ جانوروں کی کہانیاں بھی عام تھیں، گو ان کہانیوں میں جانور انسانی خصلتوں سے معمور ہیں۔ سب سے مشہور ''لقمان''، یا ایسوپ، کی حکایات ہیں۔ ایسکی لیز کا گھوڑا بولتا ہے۔ اوڈی سی اُس کا کتا بیس سال بعد مالک کو پہچان لیتا ہے۔ پر یونانیوں کا انسانوں سے شغف بے تحاشہ گہرا ہے، اور اگر اسی طرح ساوی ہستیوں سے ہے تو اُس کی وجہ یہ ہے کہ دیوتا انسانوں سے گہرے رشتہ سے جوڑے ہوئے ہیں انسانوں سے اُن کی غیر معمولی دلچسپی اس وجہ سے تھی کہ یہ ایک ایسی ہستی تھی جو فرض نبھانے کے لیے، اور فرض میں مشغول رہتی تھی۔ ان کی دلچسپی محض ''جبلت'' سے نہ تھی، بلکہ فکر اور جذبے سے بھی۔ الکی بیاڈیز فلاطون کی ضیافت میں بتاتا ہے کہ سقراط اپنے مخصوص اعلیٰ اعتبار سے اپنے فرائض کو انجام دیتا رہا ہے۔ اسی انسانی فرض کے گرد شاعری گھومتی دکھائی دیتی ہے۔ یوں بھی یونانیوں کی مستقل یہ سعی رہی کہ جذبات کے اُن متفرق پہلوؤں کا جائزہ سوچ سمجھ کر، اور مفصل طور پر لیا جائے جنھیں بآسانی سمجھا نہیں جاسکتا ہے۔

انسانوں کے رشتے سے، حقیقت سے دلچسپی نے یونانی شاعری کو کبھی بھی فرار آمادہ شاعری بننے نہ دیا۔ شاعر کا فرض تھا کہ وہ تجربات کو انفرادی طور پر بیان کریں، اور اُن تجربات کو انسان اپنے گوناگوں تجربات سے ہم آہنگ کرے۔ خوابوں کی دنیا ہمیں اپنے بنیادی فرائض سے کوتاہی برتنے پر اُکساتی ہے۔ انھوں نے ایسی تخلیق میں، حصہ لیا جہاں کہ خواب اور حقیقت یوں ملا دی گئی ہو کہ چاروں جانب نشے کا تاثر پیدا ہو جائے۔ فرار میں اُن کی دلچسپی خاصی رہی، پر وہ جانتے تھے کہ نتائج کیا اور کیسے ہو سکتے ہیں۔ ایسی صورتِ حال کو وہ ارضی امیج کے ذریعے بتانا چاہتے تھے۔ جتنا انھوں نے حقیقت سے دوری اختیار کی، اتنی ہی کوشش کی کہ اُس کے قریب رہیں (پیراڈوکس، یا قولِ محال کی ابتدایوں ہوئی)۔ بات یہ تھی کہ شعرا جانتے تھے کہ اُن کے سننے والے عام انسان تھے: شاعری محض مخصوص حضرات کے لیے پیش کی جاتی تھی، یہ زندگی کی دلچسپیوں میں سے ایک تھی۔ سوفوکلیز ''شاہ ایڈی پس'' میں ایک عظیم انسان کی حکایت سناتا ہے، جسے تقدیر، دیوتا اور حالات نے نادانستہ طور پر عظیم گناہ کرنے پر مجبور کیا۔ حکایت اساطیری ہے، لیکن پورا ڈراما دانش وری سے بھرا پڑا ہے۔ تصوّر اور حقیقت کا گہرا امتزاج موجود ہے۔ واقعات، چاہے وہ کیسے بھی ہوں، اور کہیں سے آئے ہوں، شاعری میں دانش ورانہ مدد چاہتے تھے۔ محض خیال کی اُڑان او رکارفرمائی معاشرے، اور اُس کی دلچسپی کی خاطر، سودمند نہیں تھی۔ زمین سے چپکے رہنا لازمی تھا۔

ایسی بات ہرگز نہ تھی کہ یونانی شاعری نے ہر دل عزیز بننے کے لیے کسی بھی اہم شاعرانہ تکنیکی اور سنجیدہ محرکات کو قربان چڑھا دیا ہو۔ شعرا ہوش مند اور پُر وقار تھے۔ اُن کی خواہش تھی کہ سامعین اُن کی سطح تک اُوپر اُٹھ آئیں۔ ایٹکا کے تینوں المیہ نگاروں نے اپنے ڈرامے شاعرانہ زبان میں موزوں کیے ہیں۔ جو کہ آسان زبان میں نہیں ہیں، او رنہ تو افکارات بآسانی سمجھ میں آجاتے ہیں۔ جملے مختصر، دشوار الفاظ سے پُر، دشوار استعارات سے بھرے پڑے ہیں۔ لیکن ساتھ ساتھ ایسا بھی ہوا کہ، رفتہ رفتہ، یونانی سامعین اپنے ان عظیم شعرا کی تخلیقات کو سمجھنے لگے، کہ یہ ڈرامے اس قدر دلچسپ، اہم اور ان کی زندگی سے جڑے ہوئے تھے۔ یونانیوں کے لیے لازمی ہوگیا تھا۔ کہ اُن کا معاشرہ اُن کی خصلت اُن کا ماحول، اُن کا ذوق۔ کہ وہ شاعری اور موسیقی میں پورے انہماک کے ساتھ متوجہ ہوں اور یہ شاعری، یا موسیقی انھیں غبی، کاہل اور بڑے معنی میں لااُبالی نہیں بناتی تھی۔

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ شاعری جو کہ ایک طرز کی مصنوعی زبان میں نظم کی جاتی تھی، اس قدر مقبول کیوں رہی۔ یہ ضرور ہے کہ اکثر یونانی شاعری بہت ہی سہل انگیز ہوا کرتی تھی۔ ایک ایسی ''عام'' نظم پر یکسی لا کی ہے:

دل فریب ترشے
جسے میں چھوڑ جا رہی ہوں ہیں آفتاب کی روپہلی کرنیں
اُن کے بعد جھلملاتے ستارے، ماہ تاب کا چہرہ
اور تازہ ککڑیاں بھی، اور خوبانی اور سیب

لیکن یہ آسان طرزِ تحریر ایک مصنوعی زبان سے اخذ کی گئی تھی۔ ان کی شاعری قدیم یونانی اور غیر ملکی الفاظ سے بھری پڑی ہے، نئی اور عجیب تراکیب، اور مقامی بولیوں کے الفاظ موجود ہیں۔ تشبیہہ و استعارات کا ذخیرہ موجود ہے۔ محیرالعقول استعاروں اور ترکیبوں کی ایجاد ہوئی۔ یہ زبان اُن بحروں کے لیے مناسب اور دلکش ٹھہری، بلکہ انوکھی اور حیرت میں ڈالنے والے مجموعاتِ الفاظ کے ساتھ کئی ایک تراکیب مصنوعی لگتی ہیں، جیسے ٹیموتھی اس (357-446) دانتوں کو ''چمکتے ہوئے منہ کے بچے'' کہتا ہے۔ لیکن ایسے الفاظ اور ترکیبات واستعارات ایک طرز کی رعونت اور عجوبے پن کا احساس دلاتے ہیں۔ ہومر ایکس لیز سے کہلواتا ہے کہ اُس کے گھر اور اُس کے درمیان ''سایوں کی مانند پہاڑ اور گونجتے سمندر ہیں'' انھوں نے دلکش الفاظ کی دلکش اور مناسب طریقے پر سجاوٹ کی، الفاظ ندی کے بہتے پانی کی مانند ہوگئے، خنک، رواں دواں، صاف وشفاف، لبھانے والے، اعلیٰ جذبات کے ابھارنے والے، اور انبساط بخشنے والے، شاعری کے ذریعے اُس سرخوشی اور علویت کا عالم پیدا ہو جاتا تھا جو کہ منزلِ سعادت کی جانب لے جاتی ہے۔

یونانی شاعری کا مذہب سے گہرا رشتہ رہا، کہ جس روایت نے اس کی آب یاری کی اُسے یونانی خوب جانتے تھے اس کی اہمیت اور ضرورت سے خوب واقف تھے۔ شاعری نے نہ صرف مذہب کی خدمت اور دیوتاؤں کی عزت کی، بلکہ اس روایت کو زندگی عطا کی کہ کیوں کر غیر مرئی قوتیں انسانوں کے داخل اور

خارج پُراثر انداز ہوتی ہیں۔ اس شاعری کو اُن انجانی چیزوں کی تلاش، اور انھیں شعوری گرفت میں لانے کی کوشش ہے جن سے ساری جانی دنیا بھری پڑی ہیں۔ وہ اُن قوتوں کو دریافت کرنا چاہتی ہے اور انسانوں کو اُن کی بابت، شاعرانہ طریقے پر بتانا چاہتی ہے۔ اس نامعلوم کی تلاش یوں بھی شدّت اختیار کرگئی، کیوں کہ یونانی ظاہری دنیا کے متوالوں میں سے تھے۔ خصوصاً انسانوں کی دنیا کے، جہاں کہ انسان، خصوصاً آزاد انسان، ایک دوسروں سے اور فطرت سے پیدا ہوئے رشتوں کو سمجھنے اور انھیں بہتر بنانے کی کوشش کرتے رہے تھے۔ اس ہمہ گیر اور پُر ذوق شوق نے انھیں آمادہ کیا کہ وہ اُن طاقتوں کی جستجو کریں، اور انھیں، ڈھونڈھ نکالیں، جو اُن کے خیال سے، اس دنیا کو حرکت دے رہے تھے۔

یونانیوں نے اپنی پُرشوکت اور سحر آلود الفاظ کے ذریعے، ان نامعلوم قوتوں اور ہستیوں کو آشکار کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ظاہری، اور مادّی، دنیا کو الفاظ کے بہترین جامے ملے، کیوں کہ اُن کی بنیاد ناقابل تسخیر طاقتوں پر رکھی گئی تھی اور اُس نے انھیں اس دنیا میں مسرّت اور انبساط کے جذبے کے ساتھ ملوّث ہونے کی اجازت دے دی، اور ساتھ ساتھ ایک پُرعظمت انسانی جذبے کی بھی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یونانی شاعری کی غیر معمولی قوت اس بات میں مضمر ہے کہ انھیں جیتی جاگتی دنیا سے از حد دلچسپی تھی، اور اُسے پوری طرح سمجھنے میں اور اس حقیقت کو دریافت کرنے میں جو اس دنیا سے وراء الوراء ہے۔

□□□

فورٹ ولیم کالج کے نسخۂ کلیات میر (مطبوعہ 1811) کے بعد کلام میر کا صحیح ترین اور مکمل ترین نسخہ

کلیات میر (دو جلدوں میں)

جلد اول (مکمل چھ دیوان غزلیات) صفحات: 870● قیمت 402 روپئے مجلد، 336 روپئے غیر مجلد ● سائز: 20X26X8

مرتب: ظل عباس عباسی ● بہ تصحیح و اضافہ: احمد محفوظ ● زیر نگرانی: شمس الرحمٰن فاروقی

جلد دوم (قصیدہ، مثنوی، مرثیہ وغیرہ) صفحات: 632● قیمت 430 روپئے مجلد، 410 روپئے غیر مجلد

تحقیق و ترتیب: احمد محفوظ ● زیر نگرانی: شمس الرحمٰن فاروقی

- اس نسخے کو تمام اہم اور قابل ذکر مطبوعہ نسخوں کو سامنے رکھ کر تیار کیا گیا ہے اور بقدر ضرورت قلمی نسخوں سے بھی مدد لی گئی ہے۔
- کلام میر میں مستعمل بے شمار نادر اور نامانوس الفاظ کی صحت و درستی کو بڑی حد تک یقینی بنایا گیا ہے۔
- نسخۂ عباسی جو صرف غزلیات پر مشتمل تھا اس میں نسخۂ محمود آباد سے بہت سارا کلام لے کر اضافہ کیا گیا ہے۔ اس طرح اب جلد اول میں غزلیات کی کل تعداد 1916 ہے جو ابھی تک کے تمام مطبوعہ نسخوں سے زیادہ ہے۔ غزلیات میں اشعار کی کل تعداد 13908 ہے۔
- جلد دوم میں میر کے تمام مرثیوں کو پہلی بار پوری صحت کے ساتھ مکمل صورت میں سامنے لایا گیا ہے۔
- جلد دوم میں منظومات کو پہلی بار بالکل نئی، مناسب اور با اصول ترتیب سے رکھا گیا ہے۔ اس طرح نسخے میں شامل کسی بھی منظومے کو تلاش کر لینا آسان ہوگیا ہے۔
- دونوں جلدوں میں متن کی تصحیح کے دوران مختلف مستند اور بعض نادر لغات اور فرہنگوں کا سہارا لیا گیا ہے۔
- جلد دوم میں دو تفصیلی دیباچے شامل ہیں۔ احمد محفوظ کے دیباچے میں کلام میر کی تدوین و تصحیح متن سے متعلق نہایت اہم امور زیر بحث لائے گئے ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی کے دیباچے میں مثنویات میر اور میر کے عمومی کلام پر ایک بالکل نئے پہلو سے گفتگو کی گئی ہے۔
- جلد اول میں دیگر مضامین کے علاوہ شمس الرحمٰن فاروقی کا دیباچہ نما ایک نیا مضمون ''تمہید'' کے عنوان سے شامل ہے۔
- ان دونوں جلدوں کو بڑے سائز پر سفید کاغذ اور عمدہ کمپوزنگ کے ساتھ شائع کیا گیا ہے اور سرورق ایسا ہے جو میر کے زمانے کی تہذیبی و ثقافتی روایت کی عکاسی کرتا ہے۔

کلیات میر (جلد اول و دوم) ملک کے تمام بڑے کتب فروشوں کے یہاں دستیاب ہے۔ اردو کونسل سے براہ راست بھی طلب کی جاسکتی ہے۔

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

اردو خبرنامہ

اقلیتی زبانوں کے لیے خصوصی مقام لازمی

● نئی دہلی۔ 21 فروری، کسی بچے کی ذہنی نشو و نما میں مادری زبان کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے وزیر اقلیتی امور سلمان خورشید نے اس پر زور دیا کہ اقلیتوں کی زبانوں کے تحفظ اور فروغ کے لیے ایک تحریک شروع کی جائے۔ یہاں بین الاقوامی یوم مادری زبان تقریب کا افتتاح کرتے ہوئے مسٹر سلمان خورشید نے کہا کہ نظام تعلیم میں اقلیتی زبانوں کے لیے خصوصی مقام کا تعین ضروری ہے۔ انھوں نے کہا کہ اقلیتی زبانوں کی تدریس کی گنجائش کو اقلیتوں کی خوشنودی سمجھ کر مسترد نہ کیا جائے۔ انھوں نے کہا کہ آخر کار اقلیتی اور دیگر زبانوں کو خصوصی طور پر تسلیم کرنا لازمی ہوگا۔ اگر یہ کام قومی زبان ہندی کے لیے ہوسکتا ہے تو کیا ایک اجتماعیت پسند اور حقیقی جمہوری معاشرے کے مفاد میں ان زبانوں کے لیے بھی یہی نہ کیا جائے۔ مسٹر سلمان خورشید نے کہا کہ ہم لوگوں کو اس کا پورا یقین ہے کہ اقلیتوں کی زبانوں کو فروغ دینے اور محفوظ رکھنے کے لیے مزید کام کیے جاسکتے ہیں۔ ہم لوگ یہیں سے اس کوشش کو ایک تحریک میں بدل دیں گے۔ مسٹر سلمان خورشید نے سیاسی لیڈروں سے بھی اپیل کی کہ وہ اپنی مادری زبان کے علاوہ بھی دو یا تین زبانیں سیکھیں تاکہ ہندوستان جیسے ثقافتی اور لسانی سطح پر رنگا رنگ ملک کے مختلف حصوں کے ساتھ خود کو جوڑ سکیں۔

انھوں نے کہا کہ کسی ایک خطے کی زبان جان لینے سے کسی بھی سیاسی لیڈر کو اس خطے میں پہنچنے کے بعد یقیناً فائدہ حاصل ہوگا۔ بعد ازاں ایک سوال کے جواب میں مرکزی وزیر نے کہا کہ انھوں نے وزیر فروغ انسانی وسائل کے ساتھ اسکولوں میں اردو کی تدریس یقینی بنانے کے سوال پر بھی تبادلۂ خیال کیا۔ انھوں نے کہا کہ اگرچہ ملک کے بعض حصوں میں اردو کا اقلیتی فرقے کے ساتھ خصوصی تعلق ہے لیکن اسے مسلمانوں کی زبان کہنا درست نہیں ہوگا، کیونکہ ایسے بہت سارے لوگ دوسرے فرقوں کے بھی ہیں جنھوں نے اردو زبان کی ترقی میں گراں قدر حصہ لیا ہے۔ ان سے پوچھا گیا کہ رنگا ناتھ مشرا کمیشن کی رپورٹ پر حکومت کیا کرنے جا رہی ہے؟ تو انھوں نے کہا کہ چوں کہ اس کمیٹی کی سفارشات کا تعلق مختلف وزارتوں سے ہے، اس لیے ہم لوگوں نے وزارتوں سے ان کی رائے طلب کی ہے۔ اس کانفرنس میں اقلیتی زبانوں کے لیے تحفظات پر عمل درآمد کے لیے مرکزی حکومت اور ریاستی حکومت کی طرف سے مالی اعانت کے اقدامات پر غور کیا جائے گا۔ بین الاقوامی یوم مادری زبان 2000 سے 21 فروری کو منایا جاتا ہے جس کا مقصد اتفاق اور ہم آہنگی پیدا کرنا ہے اور اس کو یقینی بنانا بھی ہے کہ لسانی اور ثقافتی رنگا رنگی پھولے پھلے۔ اس کا اعلان نومبر 1999 میں یونیسکو کی جنرل کانفرنس میں کیا گیا تھا۔ (ہمارا سماج، دہلی)

اردو کے فروغ کے لیے نئی قومی حکمت عملی کی ضرورت

● نئی دہلی۔ 13 مارچ، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ نے کہا ہے کہ آزادی کے 61 سال بعد بھی اس بات کو محسوس کیا جا رہا ہے کہ اردو کے فروغ کے لیے ایک نئے وژن اور قومی حکمت عملی کی ترتیب نو کی ضرورت ہے۔ یہ نئی حکمت عملی اور وژن اس تہذیبی تشخص کی بازیابی کو ممکن بنائے گا جو اردو زبان سے منسلک ہے اور خوبصورت آرٹ سے متعلق ہے۔ راجیہ سبھا کے ڈپٹی چیئرمین کے رحمن خان کی صدارت میں کل شام یہاں انڈیا اسلامک کلچر سنٹر میں منعقد نامور اساتذہ، ممتاز دانشوروں، سرکردہ صحافیوں اور متعدد اردو اداروں کے سربراہوں کی ایک میٹنگ سے خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر بھٹ نے کہا کہ اس صورتحال کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ اردو زبان کے پڑھانے کی سہولیات ان علاقوں میں بھی میسر نہیں ہے جہاں اردو والے کثیر تعداد میں ہیں۔ اردو سے وابستہ آرٹ فارم جیسے خطاطی، غزل، فن تعمیر اور سنگ تراشی آج کے ہندوستان میں گویا ناپید ہو رہے ہیں۔ اس خوبصورت ورثے کو بچانا بہت ضروری ہے اور این. سی. پی. یو. ایل یہ فرض نبھائے گی۔ میٹنگ میں پروفیسر گوپی چند نارنگ، مسٹر بشارت احمد (ڈائرکٹر دوردرشن)، مسٹر احمد سعید ملیح آبادی (ممبر پارلیمنٹ اور چیف ایڈیٹر روزنامہ آزاد ہند، کلکتہ)، پروفیسر ایس. آر. قدوائی، پروفیسر شفیق خاں ندوی، خبر دار جدید کے ایڈیٹر معصوم مرادآبادی، ہمارا سماج کے ایڈیٹر خالد انور، مشرقی آواز کے ایڈیٹر محمد ذکی، راشٹریہ سہارا کے بیورو چیف مسٹر اسد رضا اور پروڈیوسر محترمہ وسیم راشد، چیف کمشنر انکم ٹیکس محمد اشرف، مسٹر عزیز قریشی، دہلی اردو اکیڈمی کے وائس چیئرمین سید شریف الحسن نقوی اور اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی کے ڈائرکٹر نیز یو. این. آئی اردو سروس کے نمائندے اور دہلی اقلیتی کمیشن کے چیئرمین کمال فاروقی وغیرہ موجود تھے۔ ڈاکٹر بھٹ نے کہا کہ نئی حکمت عملی کی ترتیب کے لیے ایک اپروچ پیپر (دستاویز) تیار کرنے کی ضرورت ہے۔ کونسل اردو اور اردو کلچر سے وابستہ اہم شخصیات کی ایک راؤنڈ ٹیبل تشکیل دینا چاہتی ہے اور زبان و ادب اور کلچر سے وابستہ ان اہم شخصیات کے مشورے سے مستقبل کا ایجنڈا تیار کیا جائے گا۔ انھوں نے مزید کہا کہ گجرال کمیٹی کے نام

سے ایک رپورٹ حکومت کے پاس موجود ہے۔اس کمیٹی نے فروغ اردو کے لیے ضروری اقدامات کی سفارش کی تھی لیکن متعدد وجوہات کی بنا پر گجرال کمیٹی کی سفارشات کو عملی جامہ نہیں پہنایا جاسکا۔ انھوں نے امید ظاہر کی کہ مجوزہ گول میز کانفرنس اپنی حدود میں رہ کر نئے ہندوستان میں فروغ اردو کے لیے ایک لائحہ عمل پیش کرے گی۔ مسٹر کے رحمٰن خاں نے اپنے صدارتی کلمات میں ملک خصوصاً اتر پردیش میں اردو کی خراب صورتحال پر تشویش ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں اس بات کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے کہ بنیادی سطح پر اردو تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ انھوں نے کہا کہ یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ یو. پی میں ایک لاکھ سرکاری پرائمری اسکولوں میں ایک بھی اسکول میں اردو تعلیم کا انتظام نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ اگلے برس مردم شماری کا سلسلہ شروع ہونے والا ہے ہمیں اردو حلقوں میں بیداری مہم شروع کرنی چاہیے اور لوگوں کو زیادہ سے زیادہ اپنی مادری زبان اردو لکھوانی چاہیے۔ مسٹر رحمان خان نے یو.این. آئی اردو سروس کو مستحکم کرنے کی بات پر بھی زور دیا۔ ممتاز صحافی احمد سعید ملیح آبادی نے کہا کہ مغربی بنگال میں عجیب وغریب صورتحال ہے جہاں اردو اسکولوں کو سرکاری طور پر تسلیم نہیں کیا جاتا۔ انھوں نے کہا کہ بہار کے وزیر اعلیٰ نتیش کمار نے ان کی تجویز پر ریاست کے پرائمری اسکولوں میں 6000 اردو ٹیچر مقرر کیے ہیں جو ایک خوش آئند قدم ہے۔ انھوں نے اردو کی بقا اور فروغ کے لیے متعدد تجاویز بھی پیش کیں۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اردو کی ترقی کے لیے ٹھوس روڈ میپ پیش کیا اور اس بات پر زور دیا کہ اردو کونسل ملک بھر کے اردو حلقوں میں اردو کتابوں کے میلے منعقد کرے اور ہندوستان کے علاوہ پڑوس اور بالخصوص خلیجی ممالک میں اردو میلے لگائے۔ مسٹر خالد انور اور مسٹر محمد ذکی نے اردو اخبارات کو درپیش مسائل کا ذکر کیا اور امید ظاہر کی کہ کونسل اردو اخبارات کے مسائل کو ترجیحی بنیادوں پر حل کرنے کی کوشش کرے گی۔

(صحافت، دہلی)

حیدرآباد میں گیارھواں کل ہند اردو کتاب میلہ

● حیدرآباد۔ 28 فروری، حیدرآباد کے قلی قطب شاہ اسٹیڈیم میں قومی اردو کونسل کے ذریعے منعقدہ گیارھواں کل ہند اردو کتاب میلے کا افتتاح آندھرا پردیش ہائی کورٹ کے جج جناب غلام محمد نے کیا۔ انھوں نے اپنی افتتاحی تقریر میں قرآن پاک میں نازل پہلی وحی "اقرأ باسم ربک الذی" کے حوالے سے تعلیم وتعلم پر بے حد زور دیا اور کہا کہ مسلمانوں کو جدید تعلیم سے جڑنا چاہیے۔ انھوں نے اجمالی طور پر کونسل کی مجموعی سرگرمیوں کا بھی جائزہ لیا۔ قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ نے اپنی استقبالیہ تقریر میں اس امر پر زور دیا کہ آئین کی دفعات میں 345 اور 347 کے تحت قومی کونسل اردو زبان کی حیثیت کو تسلیم کرنے اور اسے فروغ دینے کی کوشش کرے گی۔ علاوہ ازیں حکومت ہند اقلیتی فرقوں میں جدید اور تکنیکی تعلیم کے فروغ پر خاص توجہ دے گی۔ حکومت ہند کی سرپرستی میں اردو کے کاز کو عام کرنے نیز اس کی ہمہ جہت ترقی کے لیے ہر ممکن قدم اٹھائے جارہے ہیں تاکہ اردو والے بھی اپنی مادری زبان میں زیادہ سے زیادہ بنیادی تعلیم حاصل کرسکیں۔ انھوں نے اردو کی ترویج وترقی کے لیے Approach paper ملک کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے اردو دانشوروں کے ذریعے تیار کرنے کا بھی ذکر کیا جس کی ہدایت وزارت ترقی انسانی وسائل کے وزیر جناب کپل سبل نے دی تھی۔ روزنامہ سیاست اردو کے ایڈیٹر جناب زاہد علی خاں نے کہا کہ اردو کی دھوم سارے جہاں میں ہے اور دنیا کے 107 ممالک میں کسی نہ کسی سطح پر موجود ہے لہٰذا ہمیں اپنی مادری زبان یعنی اردو میں تعلیم حاصل کرنی چاہیے۔ جناب جلیل پاشا نے بھی کونسل کی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے کونسل کے دائرۂ کار کو وسیع کرنے اور اس سے وابستہ کارکن کی بہتری پر زور دیا۔ آندھرا پردیش اردو اکادمی کے سابق صدر جناب سید شاہ نور الحق قادری نے بھی کونسل کی سرگرمیوں کا ذکر کیا اور کہا کہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ کی ڈائرکٹر شپ میں قومی اردو کونسل اردو کاز کو مزید فروغ دے گی۔ انھوں نے امید ظاہر کی کہ حیدرآباد کے جواں سال پارلیمانی رکن بیرسٹر اسد الدین اویسی اردو اور اقلیتوں کے فروغ کے لیے پارلیمنٹ کے اندر اور باہر جدوجہد کریں گے۔ بیرسٹر اسد الدین اویسی نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ Right to Education Bill کی جو روپ ریکھا وزارت ترقی انسانی وسائل تیار کروارہی ہے اس میں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ اہم رول ادا کرسکتے ہیں کیوں کہ اردو والوں میں اس کا نفاذ اسی کونسل کے ذریعے ہوگا۔ انھوں نے کونسل کے ذریعے چلائے جارہے "ایک سالہ ڈپلوما کورس ان ملٹی لنگول ڈی.ٹی.پی۔" کی ستائش کی اور کہا کہ کونسل کو مزید ٹکنالوجی سے جڑنے کی ضرورت ہے جس طریقے سے Amazon Company نے الیکٹرانک لیڈر مارکیٹ میں لاکر انسان کو پڑھنے کے لیے کافی مواد الیکٹرانک میں مہیا کردیا ہے۔ کونسل کو چاہیے کہ وہ اپنی تمام مطبوعات کو اپنی ویب سائٹ پر ڈال دے تاکہ مصنف اور قاری دونوں اس سے استفادہ کرسکیں۔ تقریب کے آخر میں اردو اکادمی آندھرا پردیش کے سکریٹری جناب فائق احمد نے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا اور اس امر پر بھی زور دیا کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کو اردو کاز کے لیے جس نوع کی بھی تعاون کی ضرورت آندھرا پردیش میں ہوگی اسے اکادمی بخوبی انجام دینے میں فخر محسوس کرے گی۔

(ہمارا سماج، دہلی)

گوپی چند نارنگ کو ساہتیہ اکادمی ''فیلوشپ''
اعلیٰ ترین اعزاز

● نئی دہلی۔ 11 فروری، اردو کے ممتاز نقاد اور دانشور پدم بھوشن پروفیسر گوپی چند نارنگ کو 'گل مہر' کانفرنس ہال انڈیا ہیبی ٹیٹ سینٹر میں منعقد ایک پروقار تقریب کے دوران ساہتیہ اکادمی کی 'فیلوشپ' سے سرفراز کیا گیا، جو اکادمی کا اعلیٰ ترین اعزاز ہے۔ اس پروقار تقریب کی صدارت ساہتیہ اکادمی کے صدر سنیل گنگو پادھیائے نے کی جبکہ نظامت کے فرائض ساہتیہ اکادمی کے سکریٹری اگر ہار کرشنا مورتی نے کی۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اس اعزاز کے لیے ساہتیہ اکادمی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ یہ اعزاز ان کے لیے بہت خاص ہے۔ انھوں نے کہا کہ تنقید ویسے ہی حاشیائی سمجھی جاتی ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ تنقید و تحقیق کے بغیر نہ تو تاریخ و ادب کا تصور ممکن ہے اور نہ شعریات و درسیات کا۔ پروفیسر نارنگ نے کہا کہ سنسکرت والوں کا قول ہے کہ شاعری کا حسن نثر کھولتی ہے۔ ایسا ہی فارسی میں بھی کہا گیا ہے کہ شعر گوئی اگر چہ موتی پرونے کا عمل ہے لیکن شعر فہمی موتی پرونے سے بھی بہتر ہے۔ انھوں نے کہا کہ ادب کی کوئی تصویر سخن فہمی یا تحسین شناسی کے بغیر مکمل نہیں۔ خود میرا ذہنی سفر اردو ادب کی حسن کاری اور اس کے جمالیاتی و تہذیبی ابعاد کے رازوں کو جاننے کی حقیری کوشش ہے۔ انھوں نے کہا کہ غالب نے کہا تھا 'ہر قدم دوریٔ منزل ہے نمایاں مجھ سے'۔ مرزا کا شکوہ اپنی رفتار سے تھا لیکن یہاں پیدل چل پانا بھی مشکل ہے۔ پروفیسر نارنگ نے اس عزت افزائی کے لیے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ خدا کرے کہ میں آپ کی توقعات پر پورا اتر سکوں۔ ساہتیہ اکادمی کے صدر سنیل گنگو پادھیائے نے پروفیسر گوپی چند نارنگ کو 'فیلوشپ' پیش کرتے ہوئے کہا کہ ساہتیہ اکادمی آج ایک ایسی ہمہ جہت شخصیت کو اپنے اعلیٰ ترین اعزاز فیلوشپ سے نواز رہی ہے جس پر جتنا بھی ناز کیا جائے کم ہے۔ انھوں نے کہا کہ پروفیسر نارنگ نے اردو اور ہندی ہی نہیں بلکہ ہندوستان کی تمام زبانوں کو فروغ دینے کے لیے قابل قدر خدمات انجام دی ہیں اور ہندوستانی ادب کو ایک وقار بخشا ہے۔ ساہتیہ اکادمی کے سکریٹری اگر ہار کرشنا مورتی نے خیر مقدمی کلمات میں کہا کہ ساہتیہ اکادمی فیلوشپ، اکادمی کا سب سے بڑا اعزاز ہے اور ہمیں خوشی ہے کہ یہ اعزاز پروفیسر نارنگ کو پیش کیا گیا ہے۔ انھوں نے نارنگ صاحب کی جملہ خدمات کا احاطہ کرتے ہوئے ایک جامع سپاس نامہ پیش کیا۔ دوسرا اجلاس 'سمواد' (اظہار رائے) پر تھا جس کی صدارت ساہتیہ اکادمی کے نائب صدر پروفیسر ستندر سنگھ نور نے کی۔ انھوں نے کہا کہ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے نائب صدر اور صدر کی حیثیت سے ساہتیہ اکادمی کی جو خدمات انجام دی ہیں وہ ناقابل فراموش ہیں۔ انھوں نے ساہتیہ اکادمی کے وقار اور معیار کو ایک نئی بلندی عطا کی اور یہ باعث افتخار بات ہے کہ اکادمی انھیں آج 'فیلوشپ' سے نواز رہی ہے۔

پروفیسر شافع قدوائی نے کہا کہ پروفیسر گوپی چند نارنگ مشترکہ تہذیب و ثقافت کے امین اور سیکولرزم کے علمبردار ہیں۔ انھوں نے اردو کی 400 سالہ فکری اور تہذیبی تاریخ کو اپنی تحقیق و تنقید کا موضوع بنا کر جس طرح اسے وسعت بخشی وہ کہیں اور دکھائی نہیں دیتی۔ شین کاف نظام نے کہا کہ عہد حاضر میں پروفیسر نارنگ کی واحد شخصیت ہے جس کا مقابلہ دنیا کی کسی بھی زبان کے بڑے ادیب سے کیا جا سکتا ہے۔ پروفیسر ہریش نارنگ نے کہا کہ ساہتیہ اکادمی نے ان کو فیلوشپ دے کر اس اعزاز کا وقار بحال رکھا ہے۔ آخر میں کنوینر اردو مشاورتی بورڈ عنبر بہرائچی نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

اس موقع پر موجود اہم شخصیات میں سید شاہد مہدی، پروفیسر مشیر الحسن، پروفیسر ابوالکلام قاسمی، پروفیسر شہریار، پروفیسر محمد نعمان، جناب مخمور سعیدی، پروفیسر اختر الواسع، نند کشور وکرم، پروفیسر صغریٰ مہدی، کے. ایس راؤ، جناب چندر بھان خیال، ڈاکٹر مولا بخش، ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ، بلراج کومل اور وسیم راشد وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ سے قبل ساہتیہ اکادمی کی 'فیلوشپ' اردو میں فراق گورکھپوری، قرۃ العین حیدر اور کیفی اعظمی کو پیش کی جا چکی ہے۔ **(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)**

اردو کے وجود سے تہذیب کا ستارہ بلند: پروفیسر پدما شا

● دربھنگہ۔ 23 فروری، ہندوستان میں اگر کسی ایک زبان نے ہندوستانی تہذیب کے پودوں کو سینچنے اور سنوارنے کا کام کیا ہے تو وہ مشترکہ تہذیب کی علامت اردو زبان ہے، کیونکہ اردو کے وجود کے بغیر ہندوستان کی کسی بھی زبان میں چاشنی کا تصور نہیں کر سکتے۔ اس زبان کی بدولت ہی ہماری تہذیب کا ستارہ بلند ہوا ہے۔ ان خیالات کا اظہار ہندی زبان و ادب کی معروف ادیبہ پروفیسر پدما شا جھا، وائس چانسلر ایل. این. متھلا یونیورسٹی، دربھنگہ نے کیا۔ پروفیسر پدما شا ملت کالج دربھنگہ میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے تعاون سے دو روزہ ادبی اجلاس ''علامہ مظہری توسیعی خطبہ'' اور ''بہار میں اردو تنقید نگاری'' کے موضوع پر سمینار کی افتتاحی تقریب سے خطاب کر رہی تھیں۔ پروفیسر پدما شا جھا نے کہا کہ ہم لکھتے دیوناگری میں ضرور ہیں لیکن ہمارے دل کی آواز جو نکلتی ہے وہ اردو ہے۔ انھوں نے اپنی کئی نظموں کے حوالے سے کہا کہ اگر اس

کے رسم الخط کو بدل دیں تو آپ اسے ہندی نہیں بلکہ اردو کہیں گے۔ انھوں نے کہا کہ اب اردو اور ہندی کا جھگڑا ختم ہو چکا ہے کیونکہ یہ ہماری تہذیب کی ایج ہے اور ہندوستانی تہذیب کی اردو اور ہندی دو آنکھیں ہیں۔ رجسٹرار متھلا یونیورسٹی بطور مہمان اعزازی اپنے خطاب میں اردو زبان کو اپنی مٹی کی بھاشا قرار دیتے ہوئے کہا کہ ہم لوگ خوش قسمت ہیں کہ اردو جیسی محبت و اخوت کی زبان ہندوستان میں پیدا ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ اردو نے ہندوستان میں دلوں کو جوڑنے کا فریضہ انجام دیا ہے۔ ڈاکٹر علی جاوید (دہلی یونیورسٹی) نے اردو کو انسان کی روح کی آواز قرار دیتے ہوئے کہا کہ اگر ہندوستان میں اردو کو کسی شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے تو اس کا مطلب شک کرنے والا ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی تاریخ سے ناواقف ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو نے ہر عہد میں یہ ثابت کیا ہے کہ سیکولرزم اس کی بنیاد ہے۔

انھوں نے کہا کہ آج ملک میں فرقہ پرستی پروان چڑھ رہی ہے، آدمی ذات اور مذہب کے نام سے پہچانا جا رہا ہے اگر کوئی زبان ان دیواروں کو توڑ سکتی ہے تو وہ اردو ہے۔ انھوں نے نئی نسل سے اپیل کی کہ اردو کے ساتھ ساتھ اپنے اسلامی کردار کا مظاہرہ کریں تاکہ آج مسلمانوں کے کردار کو جس طرح مسخ کیا جا رہا ہے اس کی اصل صورت عوام کے سامنے آسکے۔ انھوں نے غالب اور اقبال کے اشعار کے حوالے سے یہ بتانے کی کوشش کی کہ اردو نے ہمیشہ انسانیت کو فروغ دینے کی وکالت کی ہے۔ علامہ جمیل مظہری توسیعی خطبہ میں پروفیسر لطف الرحمٰن نے کہا کہ علامہ جمیل مظہری نے نہ صرف اردو غزل کی روایت کو مستحکم کیا بلکہ اس کی تقدیر اور تصویر بھی بدل دی۔ (مشرقی آواز، پٹنہ)

"غالب اور غالب کا عہد" کے موضوع پر سیمینار

● نئی دہلی۔ 20 فروری، غالب اور غالب کا عہد 19 ویں صدی کے بدلتے ہوئے مزاج کا آئینہ دار ہے۔ عہد غالب کے سلسلے میں یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ ایک عجیب و غریب صدی ہے جس نے ہماری زندگی کو ہر سطح پر متاثر کیا۔ ان خیالات کا اظہار معروف ادیب و ناقد پروفیسر شمیم حنفی نے کیا۔ وہ غالب اکادمی کے 41 ویں یوم تاسیس اور مرزا غالب کی 141 ویں یوم وفات پر منعقد غالب تقریبات کے پہلے دن سیمینار "غالب اور غالب کا عہد" کا افتتاح کر رہے تھے۔ سیمینار کی صدارت خواجہ حسن ثانی نظامی نے کی جبکہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر عقیل احمد نے انجام دیے۔ پروفیسر شمیم حنفی نے مزید کہا کہ دراصل غالب کا دور بے یقینی کا دور تھا اور یقین کی تلاش میں لوگ نہ تو ماضی کو چھوڑنا چاہتے تھے اور نہ ہی حال سے مطمئن نظر آتے ہیں۔ پروفیسر عبدالحق نے غالب کے معاصر شاہ غمگین گوالیاری، پروفیسر قاضی افضال حسین نے واقعے کی تاریخ سازی 1857 کے حوالے سے، ڈاکٹر ارجمند آرا نے غالب کا ایک ممتاز اسکالر اور مترجم رالف رسل اور وسیم احمد سعید نے مولانا فضل حق خیرآبادی کے موضوع پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ مذکورہ بالا تمام مقالات غالب کے عہد سے متعلق پڑھے گئے۔ دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر افضال حسین نے کی جبکہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر ابوبکر عباد نے انجام دیے۔ اس اجلاس میں پروفیسر یونس جعفری، پروفیسر قاضی جمال حسین اور جاوید رحمانی نے غالب اور عہد، پر مقالہ پیش کیا۔ سیمینار کے اختتام پر ڈاکٹر عقیل احمد نے لوگوں کا شکریہ ادا کیا نیز انھوں نے غالب اکادمی کی تاریخ اور اس کے ادبی سفر کا جائزہ پیش کیا۔ سیمینار میں پروفیسر ابن کنول، انجم عثمانی، ایم رحمٰن، ڈاکٹر شعیب رضا وارثی، محمد ارشد، عارف اشتیاق، افسانہ بیگم کے علاوہ کئی اہم لوگوں نے شرکت کی۔ (ہمارا سماج، دہلی)

انجمن ترقی اردو، دہلی کے زیر اہتمام 'یوم غالب' کا انعقاد

● نئی دہلی۔ 15 فروری، امسال بھی غالب کی برسی بعنوان 'یوم غالب' کی تقریب منائی گئی۔ بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی میں مزار غالب پر گل افشانی اور فاتحہ خوانی کے بعد ایوان غالب، میں صبح 11 بجے ایک روزہ سیمینار بعنوان 'غالب اور جدید ذہن' منعقد کیا گیا۔ جس میں نامور شعرا و ادبا اور اہل علم حضرات نے شرکت کی۔ اس موقع پر اپنی استقبالیہ تقریر میں ڈائرکٹر، غالب انسٹی ٹیوٹ شاہد ماہلی نے مزار غالب کی موجودہ صورت حال پر روشنی ڈالی اور غالب کے نام پر سڑک اور اسٹیشن کا نام رکھنے کی اپنی پرانی تجویز کا اعادہ کیا۔ ان کے تجویز کی سامعین و ناظرین نے تائید کی۔ افتتاحی تقریر میں ڈاکٹر خلیق انجم نے اس پروگرام کے سیاق وسباق پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ غالب کا دشمن دلی اسٹیٹ سے بڑھ کر کوئی نہیں ہے، مزار غالب اور مزار ذوق کے توسط سے منجملہ مسائل اور مختلف تحریکات پر اجمالاً روشنی ڈالی۔ پاکستان سے آئے مہمان خصوصی جناب راحت سعید کا استقبال اور شکریہ ادا کیا۔ متین امروہوی نے 'غالب نامہ' کے عنوان سے غالب کی زمین میں منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ پروفیسر علی احمد فاطمی نے 'غالب اور جدید ذہن' کے عنوان سے غالب کی تفہیم و تحقیق پر اپنا معنی خیز مقالہ پیش کیا، علاوہ ازیں سید شریف الحسن نقوی (کارگزار وائس چیئرمین، اردو اکادمی، دہلی) نے غالب کے موضوع پر گفتگو کی اور مزید کہا کہ الٰہ آباد اور جنوبی ہند میں غالب کے نام پر سڑک موجود ہے۔ اسی طرز پر دہلی میں بھی سڑک اور اسٹیشن کا نام غالب کے نام پر یقیناً ہونا چاہیے، پروفیسر شمیم حنفی نے کہا کہ غالب عجیب شخصیت کا مالک تھا۔ فقیروں سے لے کر علما تک سب کی زبان پر غالب کے اشعار ازبر ہیں۔ غالب نے اپنے عہد کو عبور کر لیا تھا۔ مہمان خصوصی

کی حیثیت سے پاکستان سے تشریف لائے اسکالر راحت سعید نے تمام اداروں کا شکریہ ادا کیا اور اپنے ملک کے ادارۂ غالب پر اظہار خیال کیا۔ سمینار کے اختتامی تقریر میں سکریٹری، غالب انسٹی ٹیوٹ، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کہا کہ غالب کو صرف رسمی طور پر یاد نہیں کیا جاتا ہے بلکہ وہ اتنا مقبول ہو گئے ہیں کہ ہماری تہذیب و افکار میں سرایت کر گئے ہیں۔ غالب کے یہاں خود مسائل کا انبار تھا لیکن ان کے مسائل ہمیں قوت و استدلال بہم پہنچاتے ہیں، ان کا کلام اور شخصیت ہمیں حوصلہ عطا کرتے ہیں۔ انھیں اسباب کی بنا پر غالب ہمارے درمیان ہیں اور آئندہ بھی رہیں گے۔ سمینار کے ناظم ڈاکٹر رضا حیدر نے تمام ادیبوں، دانشوروں اور سامعین کا شکریہ ادا کیا۔

سمینار کے بعد طرحی مشاعرہ کا اجلاس شروع ہوا۔ نظامت کے فرائض جناب کمال جعفری نے انجام دیے، جن شعرا نے اپنے کلام سے محظوظ کیا ان میں وقار مانوی، ظفر مرادآبادی، زبیر رضوی، گلزار دہلوی، کمال جعفری، متین امروہوی، انور باری، عفت زریں، عظمیٰ اختر، اسد رضا، شہباز ندیم ضیائی، ابرار کرتپوری، شاہد ماہلی، کشمیری لال ذاکر، اقبال فردوسی کے نام قابل ذکر ہیں۔

طرحی مشاعرے کے اختتام پر سامعین نے شامِ غزل میں شرکت کی، جس میں جگجیت سنگھ نے غالب کے کلام کو اپنی مسحور کن آواز میں پیش کیا۔ اجلاس کو کامیاب بنانے میں انجمن ترقی اردو ہند، دہلی شاخ کے جوائنٹ سکریٹری ڈاکٹر ادریس احمد نے اہم کردار ادا کیا۔ (پریس ریلیز)

اختر شیرانی رومانی، سماجی شاعر تھے

● جے پور۔ 17 فروری، ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام یک روزہ سمپوزیم 'اختر شیرانی: شخصیت اور خدمات' کا انعقاد کیا گیا جس میں اختر شیرانی کی شخصیت کے مختلف گوشوں اور شاعری کی مختلف جہتوں پر بحث و مباحثے ہوئے۔ سمپوزیم کے افتتاحی اجلاس کی صدارت ممتاز شاعر و نقاد شین کاف نظام نے کی۔ انھوں نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ اختر شیرانی کی شاعری کی از سر نو تفہیم کی جانی چاہیے، کیونکہ انھیں رومانی شاعر قرار دے کر ان کی دوسری شعری بصیرتوں کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اختر شیرانی نے ہندوستانی تہذیب و ثقافت کے ساتھ حب الوطنی اور سماجی سروکار کی بھی شاعری کی لیکن اس پر ہم نے بہت کم توجہ دی۔ اس موقع پر اردو مشاورتی بورڈ کے کنوینر اور ممتاز شاعر عنبر بہرائچی نے کہا کہ اختر شیرانی کا شمار ان شاعروں میں ہوتا ہے جنھیں اردو شاعری کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ پہلے اجلاس میں شاہد پٹھان نے اپنا مقالہ 'اختر شیرانی کی شاعری میں سماجی سروکار' پیش کرتے ہوئے کہا کہ ان کی شاعری میں موجود سماجی سروکار سے ان کے گہرے تجربات کا اندازہ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر ثروت خان نے اپنا مقالہ 'اختر شیرانی: حساس شاعر کی عجب داستان' پیش کرتے ہوئے ان کی شخصیت اور ان کے مزاج کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا جبکہ ڈاکٹر مولا بخش نے 'اختر شیرانی کی رومانوی شاعری' پر مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ ان کو محض رومانی شاعر کی حیثیت سے ہی پڑھنا ان کے متن کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ ان کے یہاں رومان جتنا اور جس صورت میں موجود ہے اسی قدر ان کے یہاں عصریت کا غلبہ بھی ملتا ہے۔ دوسرے اجلاس کی صدارت عنبر بہرائچی نے کی جس میں شین کاف نظام، اشفاق احمد عارفی اور رئیس احمد نے مقالے پیش کیے۔ رئیس احمد نے کہا کہ ان کی نظمیں نظم نگاری کے تاریخی سرمایے میں بیش بہا اضافہ ہیں۔ اشفاق احمد عارفی نے 'اختر شیرانی کی شاعری کے نقش ہائے رنگ رنگ' کے عنوان سے مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ اختر شیرانی اردو کے رومانی شاعروں کے سرخیل شاعروں میں شمار ہونے کے باوجود سیاسی اور سماجی حقائق سے بے نیاز نہیں رہے۔

آخر میں ساہتیہ اکادمی کے پروگرام آفیسر ڈاکٹر مشتاق صدف نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ سمپوزیم میں جے پور کی متعدد سرکردہ شخصیات نے شرکت کی جن میں عادل رضا، فیروز مسرت، تبسم رحمانی، ثریا خانم، خوشتر رحمانی، فاروق آفریدی، عابدہ فریدی، لوکیش کمار، ماہر آزاد، فاروق انجینئر، عشرت دھولپوری، عبید حاصل وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

زبان و ادب کی صورت حال پر سہ روزہ سیمینار

● نئی دہلی۔ 6 مارچ، اردو زبان و ادب کی موجودہ صورت حال پر اردو اکادمی دہلی کے زیر اہتمام منعقدہ سہ روزہ سیمینار کے دوسرے دن کے پہلے اجلاس میں اس وقت گرما گرم بحث شروع ہو گئی جب این سی ای آر ٹی کے رکن پروفیسر محمد نعمان خاں کے ذریعے پیش کیے گئے مقالے پر اردو اکادمی دہلی کے وائس چیئرمین سید شریف الحسن نقوی نے سیدھے طور پر یہ سوال کیا کہ آخر این سی ای آر ٹی سے ہندی اور انگریزی کے ساتھ اردو کی نصابی کتابیں شائع کیوں نہیں ہوتیں؟ اس کے جواب میں پروفیسر نعمان نے کہا کہ پہلے ممکن ہے ایسا ہوتا رہا ہو لیکن اب ایسا نہیں ہے۔ اس پر کئی لوگ اٹھ کھڑے ہوئے اور خود شریف الحسن نقوی نے دوبارہ مداخلت کرتے ہوئے کہا کہ میرے سوال کا جواب نہیں ملا کہ آخر اردو کی نصابی کتابوں کی اشاعت میں تاخیر کیوں ہوتی ہے۔ صدارتی تقریر میں پروفیسر غضنفر نے کہا کہ یہاں جو بھی مقالات پیش کیے گئے وہ اداروں کی بہترین کارکردگی پر روشنی ڈالنے والے تھے لیکن محض

اداروں کی تعریف کر دینے سے اردو کا بھلا نہیں ہونے والا۔ بلکہ غور کرنے والی یہ بات ہے کہ آخر اتنے ادارے ہونے کے باوجود اردو کی موجودہ حالت نا گفتہ بہ کیوں ہے؟ اس اجلاس میں پروفیسر نعمان خاں کے علاوہ ڈاکٹر ضیاء الدین صدیقی نے ہندوستانی زبانوں کے مرکزی اداروں کی خدمات، پروفیسر ابن کنول نے شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی کی خدمات، معصوم مرادآبادی نے اردو صحافت کی موجودہ صورت حال، ڈاکٹر شعیب رضا خاں وارثی نے نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اوپن اسکولنگ کی خدمات اور ممتاز عالم رضوی نے اردو اکادمی کی خدمات پر مقالے پیش کیے۔ زبیدہ حبیب نے صدارتی کلمات میں کہا کہ اردو کی موجودہ تدریسی حالت بہت ہی افسوسناک ہے لہٰذا کوئی لینگویج لیب کا قائم ہونا ضروری ہے۔ پروفیسر شاہد حسین اور پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی نے بھی اظہار خیال کیا اور پڑھے گئے مقالے کا جائزہ لیا اور اردو اکادمی کو اس بات کی مبارکباد پیش کی کہ اکادمی نے منفرد انداز کا سیمینار منعقد کیا ہے جس میں اداروں کی موجودہ سرگرمیوں کی تفصیلات سامنے آرہی ہیں۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر خوشنودہ نیلوفر نے انجام دیے۔ دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر حامدی کشمیری، پروفیسر معین الدین جینابڑے اور ڈاکٹر ریاض عمر نے کی۔ جبکہ نظامت کے فرائض شعیب رضا فاطمی نے انجام دیے۔ پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی خدمات، ڈاکٹر مظہر نے جواہر لال نہرو یونیورسٹی کی خدمات، ڈاکٹر شبانہ نذیر نے اسکولی سطح پر دہلی میں اردو زبان کی صورت حال کے موضوع پر مقالے پیش کیے۔ مقالوں پر پروفیسر اعجاز علی ارشد، پروفیسر غضنفر، آشفاق عارفی، شبانہ نذیر، پروفیسر ابن کنول وغیرہ نے سوالات کیے۔ دوسرے اجلاس کے اختتام پر اکادمی نے تخلیقی اجلاس کے طور پر ''شامِ افسانہ'' کا انعقاد کیا جس کی صدارت مشہور فکشن رائٹر جوگندر پال نے کی۔ شام افسانہ میں ڈاکٹر عبدالصمد نے اپنا افسانہ ''تجسس''، حسین الحق نے ''نون غنہ''، محترمہ ترنم ریاض نے ''سورج مکھی''، ڈاکٹر طارق چھتاری نے ''مکان سایہ''، پروفیسر معین الدین جینابڑے نے ''بھول بھلیاں''، ڈاکٹر نگار عظیم نے ''عمارت'' اور پروفیسر غضنفر نے اپنا افسانہ ''سرسوتی اسنان'' پیش کیا۔

(ہمارا سماج، دہلی)

علی گڑھ نمائش میں اردو ہندی سیمینار

● علی گڑھ۔ 11 فروری، علی گڑھ نمائش کے کلت آکاش منچ پر آذر اکادمی علی گڑھ کے زیر اہتمام ہندی اردو سیمینار منعقد کیا گیا جس کی صدارت پروفیسر انیس انصاری نے کی جبکہ نظامت کے فرائض اویس جمال شمسی اور ڈاکٹر مجیب نے مشترکہ طور پر انجام دیے۔ آذر اکادمی کی جانب سے سالانہ ایوارڈ و خطابات پیش کیے گئے جس کے تحت میرٹھ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے سربراہ ڈاکٹر خالد حسین خاں کو ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں آذر ایوارڈ برائے ادب، اور صحافت میں نمایاں خدمات کے لیے معروف صحافی ڈاکٹر ایم، یو، خاں کو آذر ایوارڈ برائے صحافت پیش کیا گیا۔

دہلی کے معروف ادیب و شاعر فصیح اکمل قادری کو نشانِ ادب 2010 برائے ادب اور معروف صحافی و سماجی کارکن الحاج اے سمیع خاں کو نشانِ صحافت 2010 کے ایوارڈ پیش کیے گئے۔ اسی کڑی میں ممتاز شاعر رئیس الدین رئیس کو ادب نواز بی۔ ایس۔ جین جوہر (میرٹھ) کو نشانِ اردو، مدھیہ پردیش سے تشریف لائے طہور منصوری نگاہ کو رباعی گوئی کے لیے قاموس سخن، فیروزآباد کے سالم شجاع انصاری کو آفتاب سخن اور سنبھل مرادآباد کے توفیق آزاد کو شناور علم و ادب کے خطابات پیش کیے گئے جس کے تحت یادگاری نشان، شال اور اسناد پیش کی گئیں۔ سیمینار میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے آیورویدک یونانی کالج کے ڈائرکٹر فائننس ڈاکٹر سید جاوید اختر اور معروف صنعت کار حاجی نورالدین نوری نے شرکت کی جبکہ مہمانان ذی وقار کی حیثیت سے خان فیڈریشن کے بانی الحاج عبدالمالک اور مارہرہ، ایٹہ کے معروف ادیب شارق عدیل اور ڈاکٹر معظم علی خاں نے سیمینار کو عزت بخشی۔ اکادمی کے چیئرمین پروفیسر صغیر افراہیم نے اپنے خطاب میں کہا کہ جس طرح آذر اکادمی علم و ادب کی خدمت انجام دے رہی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ انھوں نے شرکا سے اپیل کی کہ وہ اس آڈی ٹوریم سے عہد کر کے جائیں کہ وہ اردو کا کم سے کم ایک اخبار یا رسالہ ضرور خریدیں گے کیوں کہ ہم تب تک اردو کے سچے بہی خواہ نہیں ہو سکتے جب تک اردو کے رسائل و اخبارات کو خرید کر نہ پڑھیں۔ مہمان خصوصی ڈاکٹر سید جاوید اختر نے کہا کہ ہمیں اردو کو مجبور اور لاچار زبان نہیں سمجھنا چاہیے۔

اردو زبان ہمارے ملک میں پیدا ہوئی اور یہیں پروان چڑھی۔ یہ کسی غیر ملک کی زبان نہیں ہے اور جو لوگ اردو زبان کو غیر ملکی زبان بتاتے ہیں مجھے ان پر ترس آتا ہے۔ آذر اکادمی کے سرپرست پروفیسر انیس احمد انصاری نے کہا کہ ہندی اور اردو دونوں زبانیں ہمارے ملک کی مشترکہ تہذیب کا لازوال سرمایہ ہیں جس پر ہمیں فخر ہے اور آذر اکادمی دونوں زبانوں کی فلاح و بہبود کے لیے نہ صرف مستقل کوشاں ہے بلکہ اپنی کاوش میں کامیاب بھی ہے۔ ممتاز شاعر اویس جمال شمسی نے کہا کہ اردو ہندی دو سگی بہنوں کی طرح ہیں اور کسی زبان کو نقصان پہنچانے کا مطلب دونوں زبانوں کو نقصان پہنچانا ہے۔ انھوں نے کہا کہ آذر اکادمی دونوں زبانوں کی ترقی کے لیے سرگرم عمل ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ اکادمی ہندوستان کی مشترکہ گنگا جمنی تہذیب کی حامی و علمبردار ہے۔ اپنے

صدارتی خطبے میں ممتاز ڈاکٹر اسلم حنیف نے کہا کہ آج کے اس شاندار پروگرام کے لیے میں عزیزی مشرف حسین مضطر اور اراکین آذر اکادمی کو مبارکباد پیش کرتا ہوں جنھوں نے ہندوستان کے گوشے گوشے سے علم و ادب کے ایسے فنکاروں کو ایک ڈائس پر اکھٹا کر دیا جو بہت کم دیکھنے کو ملتے ہیں۔ (آوازِ مشرق، دہلی)

اردو فکشن کو عالمی سطح پر متعارف کرنے کی ضرورت

● پٹنہ۔23 فروری، شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے باہمی اشتراک سے ایک روزہ قومی سیمینار بعنوان ''اردو ناول میں بہار کے سماجی مسائل'' کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقعے پر مہمانانِ خصوصی ڈاکٹر پروفیسر عبد الصمد، صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر اعجاز علی ارشد، سابق صدر شعبۂ اردو بھاگل پور، ڈاکٹر لطف الرحمٰن، ایم۔ایل۔سی، ڈاکٹر اسلم آزاد، ڈاکٹر امتیاز احمد موجود تھے۔ ان مہمانوں کا خیر مقدم پروفیسر اسرائیل رضا و نظامت ڈاکٹر شہاب ظفر نے کی۔ سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے پروفیسر لطف الرحمٰن نے کہا کہ اردو میں تو ناول نگاری کی تشکیل نہیں ہوئی اردو فکشن کو جس طرح ابھرنا چاہیے ہمارے ادیبوں اور ناول نگاروں نے اس فکر و احساس کی تصویر نہیں کھینچی جو ایک ناول نگار کو فکشن کے لیے الفاظ میں کھینچنا چاہیے، شاید احساس و فکر کی مکمل تصویر پیش کرنا ممکن ہی نہیں بہار کی تشکیل کسی ناول یا فکشن میں نہیں ملتی۔ پروفیسر امتیاز احمد نے کہا کہ 1911 میں بہار بنگال سے علاحدہ ہوا تب سے آج تک فکشن کا وہ روپ ظاہر نہیں ہوا جس میں بہار کے سماجی مسائل دیکھنے کو ملے۔ فکشن کی عکاسی زیادہ بہتر پنجاب کے ناول نگاروں میں دیکھنے کو ملی۔ ڈاکٹر عبد الصمد نے اس موضوع پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ فکشن میں بہار کے سماجی مسائل بالکل نیا موضوع ہے، اس کی اہمیت بتاتے ہوئے انھوں نے کہا کہ فکشن میں عالمی حیثیت ہونی ضروری ہے۔ ڈاکٹر اعجاز علی ارشد نے کہا کہ بہار کے کئی مسائل ایسے ہیں جن کی عکاسی ایک ناول نگار فکشن کی سطح پر زیادہ بہتر ڈھنگ سے کر سکتا ہے اور دور جدید میں اس کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ (ہمارا سماج، دہلی)

اردو کی بقا کے لیے اردو والوں کو کچھ کرنا چاہیے

● نئی دہلی۔ ہر چیز کو اردو اکادمی یا حکومت پر چھوڑ دینا ٹھیک نہیں ہے۔ اردو داں حضرات کو چاہیے کہ وہ اس بات کو یقینی بنائیں کہ ان کی اگلی نسل بھی اردو سے واقف ہو سکے۔ ان خیالات کا اظہار اردو اکادمی دہلی کے دفتر میں منعقد پریس کانفرنس کے دوران اسی سال کے بہادر شاہ ظفر ایوارڈ کے لیے منتخب کی گئیں پروفیسر ساجدہ زیدی نے کیا۔

پروفیسر ساجدہ زیدی نے کہا کہ اردو کی بقا کا انحصار انعامات اور ایوارڈس پر نہیں ہے۔ اردو والوں کو مشترکہ طور پر کوشش کرنی چاہیے کہ اردو ہر اسکول میں ایک اختیاری مضمون کی حیثیت سے پڑھائی جائے۔ انھوں نے کہا کہ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ اردو کی اہم شخصیات کے بچے اردو نہیں جانتے۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں اس بات کو یقینی بنانا چاہیے کہ ہماری آئندہ نسل بھی اردو کی جانب راغب ہو۔

ممتاز ادیب اور شاعر پروفیسر مظفر حنفی نے کہا کہ کوئی صنف سخن اہم یا غیر اہم نہیں ہوتی۔ ہر چیز کی اپنی جگہ اہمیت ہے۔ کسی بھی صنف سخن کے ساتھ متعصبانہ رویہ اختیار کرنا درست نہیں ہے۔

اردو صحافت کے معیار کے تعلق سے ایک سوال کے جواب میں ریاض قدوائی نے کہا کہ سیکھنے اور سکھانے کا عمل تو دو طرفہ ہوتا ہے۔ نوجوان نسل پر ہم اپنی بات تھوپ نہیں سکتے، البتہ سینئر صحافیوں کو اس ایشو پر غور کرنا چاہیے۔ اردو کی اہم نیوز ایجنسی کی حالت بھی اطمینان بخش نہیں ہے۔ ترجمے کی اکثر خامیاں سامنے آتی ہیں۔ صحافت ایوارڈ کے لیے منتخب دوسرے صحافی ظفر آغا نے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ اردو والوں نے گزشتہ 50 سال میں اردو کی بقا کے لیے کوئی کوشش نہیں کی۔ انھوں نے بھی اکادمی کے ایوارڈوں کی تخفیف میں حکومت کے فیصلے سے نا اتفاقی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ایوارڈوں کی تخفیف درست نہیں ہے۔ افسانہ نگار پروفیسر ابن کنول اور شاعر ڈاکٹر ظفر مراد آبادی نے اس بات کی تائید کی کہ مشاعروں کے معیار میں بہتری لانے کی ضرورت ہے۔ اس موقع پر دیگر ایوارڈ یافتگان پروفیسر محمد ذاکر، ڈاکٹر یونس جعفری، بھگوان داس اعجاز اور محترمہ ساجدہ قدیر نے بھی سوالات کے جواب دیے۔ اس سے قبل اکادمی کے وائس چیرمین سید شریف الحسن نقوی نے اکادمی کے ایوارڈوں کے اعلان میں تاخیر کی وجہ بیان کی اور اکادمی کی کارگزاریوں پر روشنی ڈالی۔ آخر میں سکریٹری سید مرغوب حیدر عابدی نے اظہار تشکر کیا۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

مسعود حسین خاں اردو زبان و ادب میں ایک نمایاں نام

● علی گڑھ۔ 21 فروری، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی کی جانب سے ماہر لسانیات، نقاد اور دانشور پروفیسر مسعود حسین خاں کی ادبی و علمی خدمات کے اعتراف میں آج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ایک استقبالیہ تقریب کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت ہریانہ کے گورنر پروفیسر اخلاق الرحمٰن قدوائی نے کی۔ اس اعزازیہ تقریب میں پروفیسر مسعود حسین خاں کو ایک سپاسنامہ اور پچاس ہزار روپے کا چیک پیش کیا گیا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ اور جامعہ اردو کے سابق

وائس چانسلر پروفیسر مسعود حسین خاں کی خدمات پر غالب انسٹی ٹیوٹ، کے ڈائرکٹر شاہد ماہلی نے ایک کتاب بھی مرتب کی ہے جس کا اجرا عمل میں آیا۔ اپنی صدارتی تقریر میں پروفیسر اخلاق الرحمٰن قدوائی نے کہا کہ پروفیسر مسعود حسین خاں نے نہ صرف اردو زبان و ادب کے میدان میں نمایاں خدمات انجام دیں بلکہ لسانیات کے میدان میں بھی وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے سائنٹفک نظریہ اپنایا۔ پروفیسر قدوائی نے کہا کہ آج ان کے لیے یہ فخر کا مقام ہے کہ وہ اپنے بچپن کے ساتھی کو دل کی گہرائیوں سے مبارکباد دینے کے لیے اس تقریب میں شامل ہوئے ہیں۔ ممتاز مورخ پروفیسر عرفان حبیب نے کہا کہ مسعود حسین خاں نے ہی یہاں لسانیات کا شعبہ قائم کیا۔ وہ ہمارے لیے مشعل راہ ہیں۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کہا کہ دکنی ادب پر ان کا کام اہمیت کا حامل ہے۔ انجمن ترقی اردو ہند کے سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم نے کہا کہ مسعود حسین خاں بہت بے باک انسان ہیں اور انھوں نے اپنے چچا ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے خلاف بھی لکھا ہے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر شاہد ماہلی نے سپاسنامہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ آپ کی شخصیت سے اردو اور انگریزی داں بخوبی واقف ہیں ان کے تحقیقی مقالہ '' تاریخ زبان اردو'' کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ انھوں نے بہت سے مخطوطات کی کھوج کی اور اردو لغت پر بھی کام کیا۔ نظامت کے فرائض انجام دیتے ہوئے ڈاکٹر رضا حیدر نے مسلم یونیورسٹی کے ان شعبہ جات کا شکریہ ادا کیا جنھوں نے اس پروگرام کو انجام دینے میں غالب انسٹی ٹیوٹ کی مدد فرمائی۔ (ہمارا سماج، دہلی)

شہریار کی نظموں کے انگریزی ترجمے کی اشاعت

● علی گڑھ ۔ 27 فروری، ہندوستانی ادبیات کے مرکزی ادارے ساہتیہ اکادمی نے اردو کے مشہور شاعر پروفیسر شہریار کی سو سے زائد منظومات کا انگریزی ترجمہ شائع کیا ہے۔ پروفیسر شہریار کے شعری مجموعوں اسم اعظم (1965)، ساتواں در (1969)، نیند کی سرحد (1995)، اور شام ہونے والی ہے (2004) سے ان نظموں اور غزلوں کا انتخاب کیا گیا ہے اور انگریزی ترجمہ مشہور مترجم بیدار بخت اور میری این ارکی (کناڈا) نے کیا ہے۔ پدم بھوشن پروفیسر گوپی چند نارنگ نے پیش لفظ لکھا ہے۔ اس سے قبل بھی پروفیسر شہریار کے دو مجموعے انگریزی میں ساہتیہ اکادمی (1990) اور روپا کمپنی (2004) نے شائع کیے ہیں۔ پروفیسر شہریار کا شمار ہندوستان کے سربرآوردہ شعرا میں ہوتا ہے اور ان کے کلام کا ترجمہ انگریزی کے علاوہ دیگر غیر ملکی زبانوں روسی، فرانسیسی، جرمن میں بھی ہو چکا ہے۔ ہندوستانی زبانوں بنگالی، مراٹھی، پنجابی، تیلگو اور ملیالم میں بھی ان کی نظموں کا ترجمہ شائع ہوا ہے۔ دیوناگری رسم الخط میں شہریار کی سات کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ پروفیسر شہریار کو حال ہی میں سنبھل پور یونیورسٹی، اڑیسہ نے شاعری کے قومی ایوارڈ سے نوازا ہے۔ انھیں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ، اقبال سمان، بہادر شاہ ظفر ایوارڈ کے علاوہ بہار و اتر پردیش اردو اکادمیوں نے اپنے سب سے بڑے ایوارڈز سے بھی نوازا ہے۔ (صحافت، دہلی)

مختصرات

● ناگپور: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان حکومت ہند، نئی دہلی کے اشتراک سے یونائیٹڈ اسٹوڈینٹس ایسوسی ایشن نے مولانا آزاد کی یوم وفات کے موقعے پر ایک کل ہند سیمینار کا انعقاد کیا۔ جس میں فیروز بخت احمد نے صدارت کے فرائض انجام دیے۔ انھوں نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ اگر آج ہمارے ملک کے رہنما مولانا آزاد کے فلسفے کو اپنالیں تو ملک میں امن و خوشحالی کی فضا قائم ہوسکتی ہے۔

اس موقعے پر راشٹریہ سنت تکڑوجی مہاراج ناگپور یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر ایس این پٹھان نے کہا کہ وزیر تعلیم کی حیثیت سے مولانا آزاد نے جو نظام تعلیم بنایا تھا اس پر چل کر آج ملک ترقی کی اس منزل پر پہنچا ہے۔ ڈاکٹر شرف الدین ساحل نے کہا کہ مولانا کا بنیادی تعلیمی نظریہ قومی ضرورت کے پیش نظر تعلیم کو فروغ دینا تھا۔ ڈاکٹر سید یحیٰی نشیط نے مولانا آزاد کی تفسیر ترجمان القرآن کے حوالے سے کہا کہ انھوں نے جس انداز سے یہ تفسیر لکھی ہے اردو میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ شمیم طارق نے کہا کہ آزاد کی سیاسی بصیرت کا اس کے ہم عصروں میں کوئی مقابلہ نہیں کرسکا۔ وہ بے انتہا دور اندیش تھے۔ ڈاکٹر وہاب قیصر نے کہا کہ وہ جدید سائنسی نظریات کی نہ صرف اہمیت سمجھتے تھے بلکہ وہ اس موضوع پر اپنی تحریروں میں اس طرح اظہار و خیال کیا کرتے تھے کہ وہ اس موضوع کے ماہر نظر آتے تھے۔

ایسوسی ایشن کے سرپرست اعلیٰ جناب صدیق علی خان پٹیل نے سماجی و تعلیمی خدمت گار اور الامین مشن کے جنرل سکریٹری جناب ایم نورالاسلام کو مولانا ابوالکلام آزاد نیشنل ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ مضمون نویسی کے اول، دوم اور سوم آنے والے طلبہ و طالبات کو انعامات دیے گئے۔ (ڈاک سے)

● بریلی۔ 25 فروری، بریلی کالج میں جن کلیان سمیتی کے زیر اہتمام یوپی اردو اکادمی کا ایک روزہ سیمینار منعقد ہوا جس میں محترمہ ترنم عقیل صدر اتر پردیش اردو اکادمی مہمان خصوصی تھیں۔ محترمہ نے اپنی تقریر میں کہا کہ اکادمی اردو کے فروغ کے لیے ہر شہر میں سیمینار منعقد کررہی ہے اور ساتھ میں 60 سال کے ضعیفوں کے لیے پنشن تقسیم کروا رہی ہے اور اسکولوں کے بچوں کے لیے اسکالرشپ تقسیم کررہی ہے۔ اردو کی ترقی کے لیے لائبریری کی بنیاد رکھی جارہی ہے تعلیم پر خاص دھیان دیا جارہا ہے۔ سیمینار میں ڈاکٹر اعجاز احمد نے اردو کے

لیے کیے جا رہے کام کے لیے اتر پردیش اردو اکادمی کو مبارکباد دی ہے۔ ہر شہر میں اردو کی تعلیم کے لیے شام کی کلاسیں چلائیں جائیں گی۔ دوسرے شہروں میں غیر مسلم طالب علم بھی اس میں شرکت کر رہے ہیں انھوں نے کہا کہ کچھ شر پسند لوگ اردو زبان کو مسلمانوں کی زبان کہتے ہیں جو بالکل غلط ہے۔ یہ ایک زبان ہے اس کا کسی مذہب سے تعلق نہیں ہے۔ **(ہندوستان ایکسپریس، دہلی)**

● سہارنپور۔ 26 فروری، آج دنیا کو نفرت کی نہیں محبت کی ضرورت ہے اردو پیار و محبت کی زبان ہے اردو نفرت کو مٹا کر محبت کے پیغام کو عام کر رہی ہے اردو کسی ایک مذہب یا فرقے کی زبان نہیں ہے بلکہ ہر مذہب سے تعلق رکھنے والوں نے اس کی آبیاری کی ہے ان خیالات کا اظہار پروفیسر جلال عمر نے کیا۔ موصوف بزرگ شاعر مولانا الیاس نشتر مظاہری کے مجموعۂ کلام ''اعتبار غزل'' کے اجرا کے موقع پر ایک پروقار تقریب سے خطاب کر رہے تھے۔ پنجابی ادب کے ڈائرکٹر گور چرن سنگھ نے کہا کہ اردو زبان دنیا کی سب سے میٹھی زبان ہے یہ زبان دلوں کو جوڑنے والی ہے توڑنے والی نہیں۔ وہاج الحق کاشف نے کہا کہ ان کی شاعری میں سوز عشق موسیقی کے باوجود اعلیٰ اقدار اور اعلیٰ اخلاق و دینی مزاج نے انکی شاعری میں نکھار پیدا کر دیا ہے۔ قاری محمد اسحاق نے کہا کہ مولانا الیاس نشتر مظاہری صرف ایک شاعر ہی نہیں بلکہ ایک خوددار شخصیت کے مالک بھی ہیں وہ جتنے اچھے شاعر ہیں اتنے ہی اچھے انسان بھی ہیں۔ سماجی کارکن اے جین نے اردو شاعری کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ اردو شاعری میں جو جاذبیت ہے وہ کسی اور زبان میں نہیں۔ انجمن زندہ دلان سہارنپور کی جانب سے منعقد اس پروقار ادبی پروگرام کا آغاز بشیر شاذ کی تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ آصف شمسی، عمران احمد، فیاض ندیم نے نعت پاک پڑھی۔ پروگرام کی صدارت مولانا عزیز الحسن ایڈوکیٹ نے کی نظامت انعام راشد اور محبوب نے مشترکہ طور پر کی۔ انجمن کی جانب سے مولانا نشتر کو ایک ٹرافی اور ایک شال پیش کی گئی۔ **(ہندستان ایکسپریس، دہلی)**

● بنگلور۔ 13 فروری، بمقام دارالسلام بنگلور، کرناٹک اردو اکادمی کے زیر اہتمام سیمینار ''جدید اردو ادب اور سماج'' کے موضوع پر زیر صدارت خلیل مامون صدر کرناٹک اردو اکادمی منعقد کیا گیا۔ اس سیمینار میں اردو کے ممتاز تنقید نگار ڈاکٹر شمیم حنفی، ڈاکٹر عتیق اللہ اور ڈاکٹر شمس الحق عثمانی بحیثیت مہمانان خصوصی شریک تھے۔ انھوں نے ''جدید اردو ادب اور سماج'' کے موضوع پر اپنے مقالات پیش کیے۔ سیمینار کی افتتاحی تقریب میں صدر کرناٹک اردو اکادمی خلیل مامون اور اراکین کرناٹک اردو اکادمی و رجسٹرار پروفیسر ایس محمد رحمت الحق نے مہمانان خصوصی کی گلپوشی فرمائی اور ان کی خدمت میں مومنٹو پیش کیے۔ رکن اکادمی عزیز اللہ بیگ نے مہمانان خصوصی اور حاضرین کا خیر مقدم کیا۔ سیمینار کی افتتاحی تقریب کے بعد کرناٹک اردو اکادمی کی مطبوعات کی رسم رونمائی عمل میں آئی۔ اعظم شاہد نے سیمینار اور تقریب رسم رونمائی کی نظامت کی۔ یاد رفتگان کے تحت ملا عبدالغنی پر انور داغ کی کتاب کی رسم رونمائی بدست ڈاکٹر حنفی عمل میں آئی اور انور داغ کی دوسری کتاب ''مطالعے'' کا اجرا بدست خلیل مامون عمل میں آیا۔ غفران امجد کے شعری مجموعے ''خواب کی مٹی'' کی رسم اجرا بدست ڈاکٹر عتیق اللہ اور ضمیر عاقل شاہی پر شاہ مدار عقیل کی کتاب کی رسم اجرا بدست ڈاکٹر شمس الحق عمل میں آئی اور آخر میں محمد سراج الدین کی کتاب ''سو عظیم سائنسدان'' کی رسم اجرا بدست خلیل مامون عمل میں آئی۔

(سالار، بنگلور)

● چینئی۔ 30 جنوری کی شام اردو اکادمی رجسٹرڈ سیکولر، مدراس کے زیر اہتمام ''یوم اردو'' منایا گیا۔ ڈاکٹر شکیل معین، صدر نشیں، مہمان خصوصی، آر. پی. بھلا نیشنل پریسڈنٹ، آل انڈیا جڈیشیل، ایپلائز فڈریشن، ہریانہ، مہمان اعزازی مسند نشیں تھے۔ ڈاکٹر شکیل معین نے فرمایا کہ مدراس میں اردو زبان و ادب کی سرگرمیاں شباب پر ہیں اس طرح کی ادبی محفلیں شمالی ہند میں آج کل بہت کم دیکھی جاتی ہیں مدراس میں اچھے اچھے شاعر موجود ہیں۔ محمد اسحاق عابد کی نعت گوئی سے ماہر القادری کی یاد آتی ہے۔ وہاب تارش نے نظم اور ساغر مدراسی نے غزلیں سنائی۔ ظہیر آفاق نے ''میں اک بہانہ تھا'' کے عنوان سے افسانہ پیش کیا۔ شکیل معین نے مدراس کی ادبی فضا سے متاثر ہو کر مدراس میں ایک کل ہند مشاعرے کے انعقاد کا اعلان کیا۔ ''یوم اردو'' کی تقریب کی نظامت مدراس یونیورسٹی کے ڈاکٹر سید سجاد حسین نے فرمائی۔ پروگرام رات کے 9 بجے چیئرمین ڈاکٹر ظہیر آفاق کے اظہار تشکر پر اختتام پذیر ہوا۔ **(ڈاک سے)**

● گلستان ادب، رانچی کے زیر اہتمام 21 فروری کو رانچی میں بہار کے پروفیسر عبدالمنان طرزی کی صدارت میں ایک اعزازی نشست کا انعقاد کیا گیا جس میں مہمان خصوصی رانچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر انوار احمد خاں، مہمان اعزازی ڈاکٹر شیلیش پنڈت، ڈائرکٹر دوردرشن، رانچی اور ایس ایم خالد، ڈپٹی رجسٹرار، جھارکھنڈ ہائی کورٹ شریک تھے۔ اس کے علاوہ چینئی سے علیم صبا نویدی، جے پور سے ڈاکٹر فراز حامدی (مدیر ترسیل) پونہ سے نذیر فتح پوری (مدیر اسباق)، بہار سے شاہد جمیل (مدیر جدید اسلوب)، پونہ سے اندرا شبنم اندو (شاعرہ) میرٹھ سے ڈاکٹر اسلم جمشید پوری (افسانہ نگار)، مالیر کوٹلہ سے بشیر مالیر کوٹلوی، پنجاب سے سالک جمال آسنسول سے تقریر یوسفی اور دھنباد سے شان بھارتی (مدیر رنگ) اور گلستان ادب کے صدر اور سکریٹری ڈاکٹر ایم اے حق اور ایم زیڈ خان اسٹیج پر موجود تھے۔ جھارکھنڈ کی سرزمین پر پہلی مرتبہ

شعر و سخن کی اتنی بڑی محفل سجائی گئی تھی۔ پورا ہال سامعین سے بھرا تھا۔ اردو کے علاوہ ہندی ادب کے بھی لوگ شامل محفل تھے۔ انجمن جمہوریت پسند مصنفین کی نمائندگی اوم پرکاش برنوال اور انجمن ترقی پسند مصنفین رانچی کی نمائندگی ڈاکٹر حسن مثنی اور پروین پریمل کر رہے تھے۔ وائس چانسلر نے شمع روشن کر کے نشست کا باضابطہ افتتاح کیا۔ افتتاح کے بعد ملک کے مختلف شہروں سے تشریف لائے نامور ادیبوں، شاعروں اور محققوں کی آٹھ کتابوں کا اجرا عمل میں آیا۔ آخر میں سہیل انور کے اظہار تشکر پر نشست کا اختتام ہوا۔

(ڈاک سے)

● 20 فروری کو یوتھ ایجوکیشنل سوسائٹی کی جانب سے منعقدہ اردو چینل ٹرافی برائے بیت بازی مقابلے میں تقسیم انعامات کے دوران سوسائٹی کے جنرل سکریٹری خالد علی ملیگ نے طلبہ کی رہنمائی اور کیریئر گائیڈنس کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے یوتھ ایجوکیشنل سوسائٹی کی جانب سے گھر گھر جا کر بالمشافہ کیریئر گائیڈنس پروگرام کا اعلان کیا۔ اردو چینل بیت بازی ٹرافی کے دیگر مہمان حامد اقبال صدیقی، ڈاکٹر قاسم امام اور عبدالسلام شیخ نے مضافات میں اس طرح کے تہذیبی جلسوں کی ضرورت پر زور دیا۔

بیت بازی کے اس مقابلے میں ممبئی، تھانے اور بھیونڈی کی کل 12 کالجز کی ٹیمیں شریک ہوئیں۔ ان میں اول انعام نورالاسلام جونیئر کالج، گونڈی نے حاصل کیا جبکہ دوم انعام فلاح الاسلام، گونڈی اور سوم انعام انجمن خیرالاسلام ڈی ایڈ کالج، کرلا نے حاصل کیا۔ اے پی کالج کو کانسلیشن انعام دیا گیا۔ بہترین بیت خواں کا انعام نورالاسلام کی طالبہ سیدہ کنیز زہرہ نے حاصل کیا۔ تلفظ کی صحیح ادائیگی کا خصوصی انعام اے پی کالج کے طالب علم تابش نے حاصل کیا اور معیاری اشعار کے انتخاب کا خصوصی انعام رئیس ہائی اسکول اینڈ جونیئر کالج بھیونڈی کی طالبہ صالحہ نے حاصل کیا۔

اردو چینل بیت بازی مقابلے میں جج کے فرائض قاسم ندیم، ڈاکٹر شعور اعظمی، عبدالحنان صدیقی، ضامن محمد آبادی اور انصاری حنا یاسمین نے انجام دیے۔ نظامت کی ذمے داری قمر صدیقی نے نبھائی۔ پروگرام کو کامیاب بنانے میں خان ذاکر حسین، خالد صدیقی اور خالد علی پیش پیش رہے۔ سامعین سے پوری طرح بھرے ہوئے اپنالیہ یوتھ سینٹر کے ہال میں یہ پروگرام صبح ساڑھے 11 بجے شروع ہوا اور شام 7 بجے کامیابی سے اختتام پذیر ہوا۔ (ڈاک سے)

رسم اجرا

سلگتے خواب

● ٹانڈہ۔ 10 فروری، نوجوان شاعر زاہد ٹانڈوی کے مجموعۂ کلام ''سلگتے خواب'' کی اشاعت سے ٹانڈہ کے ادبی حلقوں میں خوشی کا ماحول ہے۔ استاد شاعر شاکر علی عیش نے مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ 38 سال پہلے راہی ٹانڈوی کا مجموعۂ ''کلام'' ہچکیاں'' منظر عام پر آیا تھا، جس کے بعد جمود طاری ہو گیا تھا اور کوئی مجموعہ شائع نہ ہو سکا، لیکن زاہد ٹانڈوی نے اس جمود کو توڑ دیا ہے، جو قابل ستائش ہے۔ دوسری جانب، انجمن ترقی اردو اتر پردیش کے جنرل سکریٹری محمود الظفر رحمانی کی رہائش گاہ پر منعقدہ میٹنگ میں زاہد ٹانڈوی کے مجموعۂ کلام کے اجرا پر خوشی کا اظہار کیا گیا۔ میٹنگ میں عثمان سیفی، حاجی محمد صغیر، رفیع انصاری، حافظ شکیل، حافظ عرفان اور نوید الظفر رحمانی وغیرہ موجود تھے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر اقبال ندیم، ڈاکٹر محمد عارف، جامع مسجد کے خطیب قاری محمد نعیم، شاعر منوج کمار دربا، نزاکت اللہ منصوری، ظفر اقبال، محمد ہارون نے بھی زاہد ٹانڈوی کو ''سلگتے خواب'' کے لیے مبارکباد پیش کرتے ہوئے ان کی ادبی خدمات کو سراہا۔ (ہمارا ساج، دہلی)

راج بھاشا

● رامپور۔ 24 فروری، قلعے کے رنگ محل میں رضا لائبریری کے ذریعے شائع ''راج بھاشا'' جریدے کا اجرا پروفیسر ستیہ پال گوتم رجسٹرار روہیلکھنڈ یونیورسٹی کے دست مبارک سے ہوا۔ پروگرام کا آغاز ستیہ پال گوتم، پروفیسر محمد اصغر سعید، پروفیسر دلیپ پانڈے اور پروفیسر عبدالسلام نے چراغ روشن کر کے کیا۔ پروفیسر شاہ عبدالسلام نے مہمان خصوصی پروفیسر ستیہ پال کو شال گلدستہ اور ایک تصویر دے کر ان کا استقبال کیا۔ نوید قیصر نے ہندی کویتا اچھی آواز میں پڑھی۔ ابوسعید اصلاحی نے رضا لائبریری میں موجود کتابوں و ہندی رسم الخط میں تحریر کتابوں کے متعلق تفصیل سے بتایا۔ پروفیسر شاہ عبدالسلام نے کہا کہ ہر زبان اپنی تہذیب سے جڑی ہوتی ہے۔ اس جریدہ میں اسٹاف ممبران، شہر کے ادیب، مصنفین کی تخلیقات، مقالے اور تحقیقی مضامین شامل ہیں۔ مہمان خصوصی پروفیسر ستیہ پال نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ یہ لائبریری ہندوستانی ادب، تہذیب اور فن کی قومی وراثت ہے۔ اس لائبریری نے عربی، فارسی، ہندی، سنسکرت، اردو کی کتب کو شائع کیا ہے اب اس میں ''راج بھاشا'' بھی شامل ہو گئی۔ پروفیسر اصغر سعید نے کہا انسانی زندگی میں زبان واحد ذریعہ ہے جس کے توسط سے انسان اپنے احساسات اور خیالات کی پہچان کراتا ہے۔ رضا لائبریری سے بیرونی لوگ فائدہ اٹھا رہے ہیں لیکن رامپور کے لوگوں کی بدقسمتی ہے کہ اس سے وہ فائدہ نہیں حاصل کر رہے تھے۔ ''راج بھاشا'' کی اشاعت کر کے رضا لائبریری نے قابل تحسین کام انجام دیا ہے۔ مسند صدارت پر موجود پروفیسر دلیپ پانڈے نے کہا کہ انسانی زندگی کا مظہر ہی زبان ہے زبان کسی سرحد سے بندھی نہیں ہوتی۔ اخیر میں اظہر نعمانی نے ایک کویتا اور چند اشعار سنائے۔ نظامت سندیپ کورنے کی۔ اس تقریب میں شہر کی معزز ہستیاں موجود تھیں۔ (صحافت، دہلی)

چھت

● مراد آباد مسلم ڈگری کالج میں مراد آباد کے افسانہ نگار ارشد اقبال کے افسانوی مجموعے ''چھت'' کا اجرا میرٹھ ڈاکٹر ایس ٹی حسن نے کیا۔ پروگرام کی صدارت ڈاکٹر اسلم جمشید پوری صدر شعبۂ اردو چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی میرٹھ اور نظامت ڈاکٹر منصور احمد صدیقی لیکچرر شعبۂ تاریخ مسلم ڈگری کالج نے کی۔ پروگرام میں مسلم ڈگری کالج کے صدر وسیم احمد خاں نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ دیگر مہمانوں میں ڈاکٹر حسن احمد نظامی ریڈر شعبۂ اردو رضا ڈگری کالج رامپور، ڈاکٹر جمیل احمد خاں پرنسپل ایم ایم ڈگری کالج، شکیل انوار صدیقی اور قمر قدیر ارم شامل تھیں۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی ایس ٹی حسن نے کہا کہ اردو کا معیار دن بدن گرتا جارہا ہے۔ بعد ازاں ایک پروقار تقریب بعنوان ''جگر میموریل لیکچر'' منعقد کی گئی جس کا موضوع تھا'' جگر کی عشقیہ شاعری''۔ تقریب کی صدارت وسیم احمد خاں اور نظامت ڈاکٹر منصور احمد صدیقی نے کی۔ اس تقریب کے مقرر پروفیسر اصغر عباس نقوی سابق چیئر مین شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی تھے۔ انھوں نے جگر میموریل لیکچر کے تحت جگر کی عشقیہ شاعری پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ پروگرام کا انعقاد قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے تعاون سے ہوا۔ پروگرام میں عتیق حسن خاں، گگن بھارتی، فہیم علی، رضا جمیل، ڈاکٹر جمیل اور احمد رشید بخشی وغیرہ شامل تھے۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

اردو کی خواتین ناول نگار

● ریاست بہار کی ادبی تنظیم علمی مجلس بہار نے بہار اردو اکادمی کے وسیع ہال میں تقریب اجرا کا انعقاد کیا۔ ویرکنور سنگھ یونیورسٹی، آرہ میں صدر شعبۂ اردو فارسی ڈاکٹر ایس کے جبیں کی تصنیف ''اردو کی خواتین ناول نگار'' کا اجرا سابق وزیر اعلیٰ بہار ڈاکٹر جگناتھ مشرا کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ صدارت پروفیسر وہاب اشرفی نے کی۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر نسیم احمد نسیم نے انجام دیے۔ پروگرام کا آغاز حافظ یونس مشہدی کی تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ بعد ازاں پرویز عالم نے علمی مجلس بہار کی ادبی سرگرمیوں کا مختصر ذکر کیا اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

ڈاکٹر نسیم احمد نسیم ''اردو کی خواتین ناول نگار'' کا معروضی اور مدلل جائزہ پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر منظر نے کہا کہ خواتین ناول نگاروں کی اکثر حق تلفی ہوتی رہی ہے لیکن ڈاکٹر جبیں نے اس کا ازالہ کر دیا ہے پروفیسر اعجاز علی ارشد نے کہا کہ محترمہ جبیں نے ہندوستان اور پاکستان کی تمام اہم ناول نگاروں کا عمدہ مطالعہ پیش کیا ہے انھوں نے اس موقعے پر اردو کے ساتھ ہو رہی ہر طرح کی زیادتیوں کا ذکر کیا۔ پروفیسر طلحہ رضوی برق نے کہا کہ پہلے ناول پڑھنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ لیکن جب ناول رومان کے ماحول سے نکل کر حقیقت کا ترجمان بنا تو اس کی اہمیت مسلم ہوئی اور آج یہ اردو کی اہم صنف ہے۔

ڈاکٹر جگناتھ مشرا نے اپنی تقریر کے دوران ڈاکٹر ایس کے جبیں کی کتاب کو سراہا انھوں نے اردو کی گذشتہ اور موجودہ صورتحال کے تئیں اپنی تشویش کا اظہار کیا اور کہا کہ اردو کو اس کا حق ملنا چاہیے کیونکہ یہ زبان نہ صرف شیریں اور ہر دلعزیز ہے بلکہ اس کا ایک سیکولر کردار بھی ہے۔ صدر تقریب پروفیسر وہاب اشرفی نے اپنی تقریر میں مصنفہ کی تصنیف کو ان معنوں میں اہم قرار دیا کہ انھوں نے بالخصوص خواتین ناول نگاروں کو اپنے مطالعے کا حصہ بنایا ہے۔

(ڈاک سے)

اعزاز و اکرام

● نئی دہلی۔ 14واں ''مجلس فروغ اردو ادب ایوارڈ'' (دوحہ قطر) اردو کے لیے کہنہ مشق فکشن نگار رتن سنگھ کا انتخاب کیا گیا ہے۔ پاکستان میں یہ ایوارڈ ممتاز ادیب اور دانشور مسعود مفتی کو دینے کا اعلان کیا گیا ہے۔ ہندوستان میں جیوری کے چیئر مین ممتاز نقاد اور پدم بھوشن پروفیسر گوپی چند نارنگ کی صدارت میں انڈیا انٹرنیشنل میں منعقد ہوئی۔ اراکین جیوری میں پروفیسر شہریار، بلراج کومل اور پروفیسر ارتضیٰ کریم شامل تھے۔ مجلس فروغ اردو ادب، دوحہ قطر کے بورڈ آف ٹرسٹیز کے چیئر مین محمد عتیق ہیں۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کہا کہ رتن سنگھ اپنے فکشن میں ہمیشہ سماجی نابرابری، استحصال اور بے انصافی کے خلاف آواز اٹھاتے رہے ہیں۔ ان کی نثر صاف، سادہ اور دل نشیں ہوتی ہے۔ ان کا فن اور آرٹ کہانی پن کے جملہ تقاضوں کو پورا کرتا ہے اور انسان دوستی و یگانگت کے جذبے سے سرشار ہے۔ وہ زندگی کو مذاہب اور مسالک کی نظر سے نہیں بلکہ ظالم اور مظلوم کی نظر سے دیکھتے ہیں اور ان کا فکشن مظلوم انسان کے دُکھ درد اور محرومی کی آواز بن جاتا ہے۔

مجلس فروغ اردو ادب کے اس ایوارڈ کے اعلان کی تقریب میں متعدد سرکردہ شخصیات نے شرکت کی جن میں پروفیسر اختر الواسع، عزیز برنی، راحت سعید (پاکستان)، پروفیسر سویامانے، پروفیسر ماسیاب (جاپان)، مسز منورما نارنگ، چندر بھان خیال، اسد رضا، ڈاکٹر ترون نارنگ، پروفیسر خالد محمود، پروفیسر نعمان خاں، ڈاکٹر مولا بخش، ڈاکٹر وسیم بیگم، ظہیر احمد برنی، ڈاکٹر پرویز شہریار، کفایت دہلوی، ڈاکٹر مشتاق صدف، محمد ہادی رہبر، موسیٰ رضا، سلیم صدیقی اور ڈاکٹر تنویر حسین کے نام قابل ذکر ہیں۔

رتن سنگھ کی اب تک دس کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں جن میں سے چھ افسانوی مجموعے، تین ناولٹ اور ایک خودنوشت ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے

دیگر زبانوں سے 9 کتابوں کے تراجم کیے ہیں اور پنجابی زبان میں بھی اپنی نگارشات پر مشتمل تین تصانیف شائع کی ہیں۔ یہ ایوارڈ ڈیڑھ لاکھ روپے نقد، طلائی تمغہ اور سپاس نامہ پر مشتمل ہے۔ جو ہر سال دوحہ قطر کی ایک شاندار تقریب میں پیش کیا جاتا ہے۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● علی گڑھ۔ سائنس اور کائنات سوسائٹی آف انڈیا نئی دہلی کے زیر اہتمام منعقدہ ایک شاندار تقریب اور تکنیکی میلے کے موقعے پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اجمل خاں طبیہ کالج کے سینئر پروفیسر ابوقمر خاں کو ان کی تدریسی، تحقیقی اور طبی خدمات اور کئی کاموں کے لیے 2009 کے ڈاکٹر ذاکر حسین میموریل ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔

قابل ذکر ہے کہ پروفیسر خان کے ساتھ سائنس کے میدان میں ایس اے ایس نقوی، شعبۂ ارضیات اور سماجی خدمات کے لیے رانا صدیقی ممبر وقف بورڈ اور بار کونسل نئی دہلی کو بالترتیب سر سی وی رمن ایوارڈ سر سید میموریل ایوارڈ سے نوازا گیا۔ پروفیسر اے بی خان کو اعزاز دیے جانے پر شعبہ اور فیکلٹی میں مسرت کی لہر دوڑ گئی ہے۔ ایسا پہلی بار ہوا کہ جب اس قسم کے کسی اسٹیج سے یونانی میڈیسن کے کسی فرد کو اس طرح سرفراز کیا گیا ہو اور ان کی خدمات کو سراہا گیا ہو۔ پروفیسر خان شعبے کے سربراہ ہیں۔ اس سے قبل وہ یونانی میڈیسن فیکلٹی کے ڈین اور پرنسپل رہ چکے ہیں اور سی سی آئی ایم کے سینئر ممبر ہیں۔ اس کے علاوہ وہ انٹرنیشنل سوسائٹی فار ہارٹ ریسرچ کے فاؤنڈر ممبر بھی ہیں۔
(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● نئی دہلی۔ فریڈم فائٹرس میموریل فاؤنڈیشن اور اردو پریس کلب کے اشتراک سے پارلیمنٹ ہاؤس کے کانفرنس ہال میں منعقدہ جلسے میں مقررین نے عظیم مجاہد آزادی اور ملک کے پہلے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد کے افکار و نظریات اور تعلیمات کو بروئے کار لانے کی ضرورت پر زور دیا تاکہ ملک میں رواداری اور ہم آہنگی کو مزید فروغ دیا جاسکے۔ اس جلسے کی صدارت دہلی پردیش کانگریس کمیٹی کے صدر اور ممبر پارلیمنٹ جے پرکاش اگروال نے کی جبکہ سابق مرکزی وزیر اور لوک سبھا کے سابق اسپیکر بلرام جاکھڑ نے مہمان خصوصی اور سینئر صحافی کلدیپ نیر نے مہمان ذی وقار کے طور پر شرکت کی۔ اس موقع پر ممتاز شاعر بشیر بدر کے علاوہ زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والی شخصیات کو مولانا ابوالکلام آزاد ایوارڈ سے نوازا گیا۔ بلرام جاکھڑ نے کہا کہ انسانیت اور رواداری ہی اتحاد کی ضمانت ہے۔ معروف صحافی کلدیپ نیر نے مولانا آزاد کے ذریعے ملک کی گنگا جمنی تہذیب کو مستحکم بنانے کی کاوشوں کو خراج عقیدت پیش کیا اور کہا کہ اس کوشش کی اور زیادہ ضرورت ہے۔ سابق گورنر سید سبط رضی نے مولانا آزاد کی وطن پرستی اور انسان دوستی کے حوالے سے موجودہ حالات میں ان کی معنویت اور اہمیت کو اجاگر کیا اور آج کی نسل سے ان کی تعلیمات اور پیغام پر عمل کرنے کی تلقین کی۔ دہلی پردیش کانگریس کے صدر جے پرکاش اگروال نے کہا کہ مولانا آزاد آج ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن ان کی سوچ اور ان کے نظریات ہمارے لیے مشعل راہ ہیں جن سے ہمیں استفادہ کرنا چاہیے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کورٹ کے رکن ڈاکٹر معراج الدین احمد نے استقبالیہ کلمات پیش کیے۔ فاؤنڈیشن کی جنرل سکریٹری اور پروگرام کی کنوینر راشدہ باقی حیا نے تقریب کے مقاصد بیان کرتے ہوئے ایوارڈ یافتگان کا تعارف کرایا۔ اس موقع پر ڈاکٹر بشیر بدر نے اپنے کلام سے بھی سامعین کو محظوظ کیا۔ بشیر بدر کے علاوہ جن دیگر شخصیات کو ایوارڈ سے نوازا گیا ان میں راجندر ریڈی (آندھرا پردیش) نجیب اگروال، ڈاکٹر جاوید اختر، وسیم احمد، راجندر پرساد سنگھ، نسیم نیازی اور نسیم نوری کے نام شامل ہیں۔ جلسے میں اردو پریس کلب کے جنرل سکریٹری طارق فیضی، فصیح اکمل قادری، شمع پروین قادری، ڈاکٹر سلمیٰ شاہین، حاجی تاج الدین، شبنم نسیم اور نسرین طارق کے علاوہ بڑی تعداد میں لوگ موجود تھے۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● شہر کے ابھے پرشاد آڈیٹوریم میں جمعرات کو بین الاقوامی مشاعرے اور کوی سمیلن کا انعقاد ہوا۔ اس موقع پر "بھروسہ نیاس" کی جانب سے نامور ادیب اور گیت کار جناب جاوید اختر کو ایک لاکھ روپے کا چیک، توصیفی سند اور شال دے کر اعزاز سے نوازا گیا جب کہ سہارا انڈیا میڈیا کے اڈیٹر اور نیوز ڈائرکٹر جناب اوپندر رائے کو نوجوان صحافی کے اعزاز سے نوازا گیا۔ انھیں 51 ہزار روپے، توصیفی سند اور شال نذر کی گئی۔ اس پروگرام میں سپریم کورٹ کے سابق چیف جسٹس جے ایس ورما مہمان خصوصی تھے۔ مرکزی وزیر سلمان خورشید اور شری پرکاش جیسوال کے علاوہ مدھیہ پردیش کے سابق گورنر بلرام جاکھڑ بھی پروگرام میں موجود تھے۔

مشاعرے میں نیرج، بیکل اتساہی، راحت اندوری، آلوک شریواستو اور منور رانا سمیت تقریباً 20 شاعروں اور کویوں نے شرکت کی۔ اس پروگرام میں ملک اور بیرون ملک سے آئے کویوں اور شاعروں نے بھی حصہ لیا۔ آڈیٹوریم شائقین سے پورا بھرا تھا۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● لکھنؤ۔ کھن کھن جی گرلز پی. جی. کالج کی سالانہ تقریب میں ریاست کے گورنر بی. ایل. جوشی نے کالج کی معلمہ ڈاکٹر ریشماں پروین کی ادبی خدمات کے لیے اعزاز سے سرفراز کیا۔

ریاستی گورنر بی. ایل. جوشی نے طالبات کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ کسی بھی تعلیمی ادارے کی ترقی کی اساس اس کے اساتذہ ہوتے ہیں۔ انھوں نے تمام معلمات کی تعریف کرتے ہوئے انھیں مبارکباد دی خصوصاً ڈاکٹر ریشماں

پروین کی خدمت میں ہدیۂ تبرک پیش کیا اور کہا کہ ہمیں امید ہے کہ ڈاکٹر ریشماں پروین اپنے فرائض منصبی کو بحسن وخوبی انجام دیتی رہیں گی اور یہ کالج دن بہ دن ترقی کرتا رہے گا۔

ڈاکٹر ریشماں پروین نے حال ہی میں میر تقی میر کے 250 سالہ تنقیدی سرمایے پر تصنیف ''میر تنقید'' تحریر کی ہے۔ جسے ادبی حلقوں میں کافی سراہا گیا۔ پروفیسر شارب ردولوی، پروفیسر انیس اشفاق، پروفیسر شمیم نکہت، عابد سہیل، مرزا شفیق حسین شفق وغیرہ نے اس کتاب کو میر تنقید میں ایک اہم اضافہ سے تعبیر کیا ہے۔ (ڈاک سے)

● مدھیہ پردیش اردو اکادمی نے اس سال 10-2009 کے لیے تین کل ہند اور دس صوبائی اعزازات کا اعلان کر کے ایوارڈ تقسیم کیے۔ یہ انعامات 8 فروری 2010 کو مدھیہ پردیش اردو اکادمی کی عمارت سنسکرتی بھون ہال میں اکادمی کے چیئرمین پدم شری ڈاکٹر بشر بدر، نائب چیئرمین ایڈوکیٹ بیگ اور اکادمی کی سکریٹری محترمہ نصرت مہندی صاحب کی موجودگی میں تقسیم کیے گئے۔ رونق جمال کو ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں شاداں اندوری کل ہند اعزاز برائے اردو زبان و ادب تفویض کیا گیا۔ ایوارڈ میں مومنٹو، سپاس نامہ، شال اور پندرہ ہزار روپئے شامل ہیں۔ رونق جمال کے چار افسانوی مجموعے، قتل کا موسم، پھول کھلنے دو، قوسِ قزح اور پنجرے کا آدمی، ڈراموں کے دو مجموعے ''گونج'' اور ''ایک پریشان باقی انجان'' اور ہندوستان میں پھیلی گاجر گھاس پر ایک جامع مقالہ شائع ہو چکا ہے۔ اردو ادب کے لیے کل ہند اعزاز پانے والے رونق چھتیس گڑھ صوبے کے واحد قلمکار ہیں۔ (ڈاک سے)

مشاعرے

● دیو بند۔ 14 فروری، دیو بند یونانی میڈیکل کالج میں اجمل ڈے کے موقع پر مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس میں مقامی شعرا کی شرکت کے ساتھ اطبا نے مختلف زبانوں میں حکیم اجمل خاں کی حیات پر روشنی ڈالی۔ پروفیسر حکیم سلیم نے کہا کہ حکیم اجمل خاں قومی یکجہتی اور ہندو مسلم اتحاد کی علامت تھے۔ مدثر کشمیری نے اپنے خطاب میں کہا کہ حکیم صاحب کا ذہن تحقیقی تھا انھوں نے یونانی و ہربل کی ریسرچ کو یوروپی ممالک میں تعارف کرانے کے لیے ہر وہ راہ اپنائی جو اس دور میں مناسب تھی۔ اجملین کی تحقیق انھی کی فکر کا نتیجہ ہے۔ اس کے بعد مشاعرے کا باضابطہ افتتاح نگر پالیکا چیئرمین مولانا حسیب صدیقی و ڈاکٹر ظریف احمد قریشی کے دست مبارک سے ہوا۔ جن شعرا نے اپنا کلام سنایا ان میں ڈاکٹر نعمان انور، ناشر کاظمی امروہوی، گلفام راز، احمد مظفر نگری، تنویر اجمل، نعیم اختر دیو بندی، ڈاکٹر منصور قاسمی، سلمان دلکش، شمیم کرتپوری کے علاوہ نسیم سہارنپوری، ڈاکٹر تنویر گوہر، ڈاکٹر قمر الزماں قمر، ولی وقاص، ذکی ماہر، دلشاد خوشتر شامل تھے۔ نظامت ڈاکٹر منصور قاسمی نے کی۔ مہمانِ خصوصی اوم پال سنگھ تھے اور صدارت نگر پالیکا چیئرمین حسیب صدیقی انجام دی۔ اس موقع پر اطبا و شعرا کو ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے توصیفی سند سے نوازا گیا۔ خصوصی شرکا میں ڈاکٹر ہلال، عاصم، معیز، انعام قریشی وغیرہ شامل تھے۔ آخر میں ڈاکٹر کاشف نے اپنے تمام شعرا و مہمانان کرام کا شکریہ ادا کیا۔

(ہندوستان ایکسپریس، دہلی)

● دیواس، مدھیہ پردیش کے شہر دیواس میں جشن غوث غریب نواز کے موقع پر ایڈوکیٹ ڈاکٹر جاوید اللہ قادری نے ایک مشاعرہ کا اہتمام کیا جس میں ملک کے مختلف مشہور اور معروف شعرا نے حصہ لیا۔ اس مشاعرے کی صدارت مدھیہ پردیش قاضی کونسل کے خزانچی اور دیواس شہر کے قاضی مولانا عرفان احمد اشرفی نے کی۔ اس موقع پر عالمی شہرت یافتہ شاعر راحت اندوری نے اپنے مخصوص انداز میں محفل کی رونق بڑھائی۔ ان کے علاوہ اختر گوالیاری نے بھی اپنے اشعار سے سامعین کی داد و تحسین پائی۔

برھان پور سے آئے شاعر ڈاکٹر جلیل الرحمن جلیل نے بھی اپنے شعروں سے سماں باندھ دیا۔ اجین شہر کی نمائندگی کرنے والے شاعر ڈاکٹر ضیا رانا نے بھی اپنا کلام سنا کر داد حاصل کی۔ اس موقع پر مدھیہ پردیش قاضی کونسل کے خزانچی اور دیواس شہر کے سینئر قاضی مولانا عرفان احمد اشرفی نے صدارتی کلمات میں اردو کی اہمیت و افادیت کو سمجھتے ہوئے کہا کہ اردو بہت ہی شیریں زبان ہے اور اس زبان نے ملک کی یکجہتی کو تقویت دینے کا کام بہت ہی باثر انداز میں ادا کیا ہے۔ اس زبان سے محبت اور لگن کے ساتھ اس کو اور فعال بنانے کی ضرورت کو نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے۔ انھوں نے مشاعروں کی اہمیت پر بولتے ہوئے کہا کہ اردو کے فروغ کے لیے عوام کی دلچسپی کا خیال رکھتے ہوئے اس طرح کے مشاعروں کا انعقاد کیا جانا چاہیے۔

● نئی دہلی۔ 11 فروری، شمال مشرقی دہلی کے مصطفےٰ آباد حلقے کی گلی نمبر 2 میں مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت ایم.ایل.اے. حسن احمد نے کی اور مہمانِ خصوصی کے طور پر دہلی پردیش کانگریس کمیٹی کے صدر و ممبر آف پارلیمنٹ جے پرکاش اگروال شریک ہوئے۔ اس موقع پر جے پرکاش اگروال نے عوام کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ آج میں کافی خوش ہوں کہ اردو شاعری سننے کو مل رہی ہے۔ میں سیاسی پروگراموں سے کافی اکتا گیا تھا۔ ایسے پروگرام میں شرکت کرنے کے بعد دل و دماغ دونوں کو سکون ملتا ہے۔ اردو وہ زبان ہے جس کو سننے اور بولنے میں کافی لطف آتا ہے۔ مجھے بچپن سے ہی اردو شاعری سننے کا شوق ہے، حسن احمد نے کہا کہ اردو شاعری سے تہذیب کے چراغ روشن

ہوتے ہیں۔ آج بھی لوگ اردو شاعری کے دیوانے ہیں اس موقعے پر جن شعرا نے کلام سنایا ان میں:

ڈاکٹر ماجد دیوبندی، عظمیٰ اختر، علی رضا عدیل سانکھوی، محمد انجم بڈھانوی، سکندر عاقل، نذہت امروہی، نکہت امروہوی، رفعت جمال پور، سراج پیکر پانی پت، دانش اسعدی آخر میں مشاعرہ کے کنوینرس حاجی فہیم الدین، محمد معروف خان، ستیش چودھری ہنو، اشوک بھکیل، کپل گپتا، محمود حسن ایم پی ڈاکٹر عرفان اور دانش ایوبی کو شالیں اڑھا کر جے پرکاش اگروال اور حسن احمد نے استقبال کیا۔ اس موقع پر انا دہلوی ایس یوظفر وفا سہارنپوری، شرف نانپاروی، انداز دہلوی، عادل رامپوری شامل تھے۔ (صحافت، دہلی)

● نئی دہلی۔ غالب اکادمی کے 41ویں یوم تاسیس اور مرزا غالب کے 141 ویں یوم وفات کے موقع پر سہ روزہ تقریبات طرحی مشاعرے کے ساتھ اختتام پذیر ہوگئیں۔ استاد شاعر وقار مانوی کی صدارت میں منعقد مشاعرے میں تقریباً 3 درجن شعرانے غالب کی زمینوں میں طرحی کلام پیش کیے۔ مشاعرے کی نظامت معروف صحافی اور ادیب فاروق ارگلی نے اپنے مخصوص لب ولہجے میں کی۔ غالب کے تین مصرعے

"نہ گل نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز"

"دست تہہ سنگ آمدہ پیمان وفا ہے"

اور

"غم دنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اٹھانے کی"

شعرا کو طبع آزمائی کے لیے دیے گئے تھے۔ جن شعرا نے اپنا کلام سنایا ان میں وقار مانوی، فصیح اکمل، ابرار کرت پوری، اسد رضا، نسیم عباسی، کمال جعفری، شہپر رسول، احمد محفوظ، فاروق ارگلی، متین امروہوی، ظفر مرادآبادی، ڈاکٹر تابش مہدی، شہباز ندیم ضیائی، شمس رمزی، سلیم صدیقی، نواب تقی شیر کوٹی، سلمیٰ شاہین، انا دہلوی، ممتا کرن، برقی اعظمی، ایس یوظفر، رؤف رامش، شاہد انجم، معین شاداب، جاوید مشیری، محمد ولی اللہ ولی، پرویز جامعی، سکندر عاقل، شریف شہباز، فرمان چودھری۔ سلطان الحق شہیری شامل تھے۔ آخر میں غالب اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر عقیل احمد نے اظہار تشکر کے دوران اکادمی کی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● نئی دہلی۔ اردو مشاعروں کی حالیہ صورت حال اور ان کی اصلاح کے سلسلے میں شرائن ایکشن گروپ آف ایجوکیشن کی جانب سے نہرو ہاؤس، جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ایک ادبی تقریب کا انعقاد ہوا۔ مہمان خصوصی کے طور پر ڈاکٹر کمال احمد صدیقی، پروفیسر خالد محمود اور ماہنامہ آج کل کے مدیر ڈاکٹر ابرار رحمانی کے علاوہ چنئی کے ڈائرس گروپ آف کمپنیز کے منیجنگ ڈائرکٹر فضل الرحمٰن نے شرکت کی۔ پروگرام کی صدارت کمال احمد صدیقی نے اور نظامت معین شاداب نے کی۔ مشاعرے سے پہلے شرائن ایکشن آف ایجوکیشن کے ارکان اور سید تالیف حیدر، ہارون صدیقی، سید تصنیف حیدر، پروفیسر خالد محمود، ڈاکٹر ابرار رحمانی اور ڈاکٹر کمال احمد صدیقی نے اظہار خیال کیا۔ آخر میں شرائن ایکشن گروپ آف ایجوکیشن کے صدر سید فیضان علی نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ فصیح اکمل قادری، ڈاکٹر شہپر رسول، فرحت احساس، ڈاکٹر احمد محفوظ، شکیل جمالی، ڈاکٹر عبیدالرحمٰن، معین شاداب، شمس رمزی، نعمان شوق، ڈاکٹر عمیر منظر، سید تصنیف حیدر کے علاوہ ڈاکٹر کمال احمد صدیقی نے اپنی طویل نظم بھی پیش کی اور خالد محمود، رؤف رضا، خواب افلاکی، عرفان احمد، شاہد انور اور سید تالیف حیدر نے اپنا کلام سنایا۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● 21 فروری، کرناٹک اردو اکادمی اور حدیقۃ الادب کے زیر اہتمام بمقام سینٹ میتھائز ہائی اسکول، میسور، زیر صدارت چندر بھان خیال، وائس چیئرمین قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی ایک شاندار کل ہند مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا۔ مشاعرے میں ڈاکٹر جاوید نعیم صدر حدیقۃ الادب، میسور، بحیثیت مہمان اعزازی شریک تھے۔ ناظم مشاعرہ شفیق عابدی نے شعرائے کرام کا تعارف کراتے ہوئے سامعین کا خیر مقدم کیا۔ صدر کرناٹک اردو اکادمی خلیل مامون نے ڈاکٹر جاوید نعیم کی گل پوشی کی اور ان کی خدمت میں مومنٹو پیش کیا۔ مشاعرے سے قبل سید شفیع احمد سکریٹری حدیقۃ الادب میسور نے رپورٹ پیش کی اور ڈاکٹر عرفان نیازی نے سامعین کی فرمائش پر بعنوان احساسات نظم سنائی۔ مشاعرے کا آغاز قرأت کلام پاک سے ہوا۔ مشاعرے میں شریک شعرا کے نام حسب ذیل ہیں: حسن چلوی، تخی سرمست، مسیح حیدر مسیح، افضل منگلوری، آغا سروش، شائستہ یوسف، عزم شاکری، نسیم راشد برہانپوری، خلیل مامون، سردار ایاغ، نورالدین نور، انجم بدایونی، اکرام کاوش، انجم بارہ بنکوی، آخر میں صدر مشاعرہ چندر بھان خیال کو دعوت سخن دی۔ چندر بھان خیال نے پہلے غزل کے کچھ اشعار اور پھر نظم سنا کر سامعین سے داد حاصل کی۔ ان کے اس شعر پر انھیں داد وتحسین سے نوازا گیا۔

جستجو کے پاؤں اب آرام سا پانے لگے
اب ہمارے پاس بھی کچھ راستے آنے لگے

صدارتی کلام کے بعد شفیق عابدی کے شکریے کے ساتھ یہ شاندار کل ہند مشاعرہ رات دیر گئے۔ 3-15 بجے اختتام پذیر ہوا۔ ان کے علاوہ جن شعرا نے اپنے کلام سے نوازا، ان میں سید احمد راحل، برکت علی آنسو، خلیل بے یاس، شعیب مرزا، سلیمان خمار اور حق کانپوری شامل تھے۔ (ڈاک سے)

یادِ رفتگاں

آہ مخمور سعیدی

● قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ کی صدارت میں ایک تعزیتی میٹنگ کا انعقاد کونسل کے دفتر میں کیا گیا۔ جس میں قومی کونسل کے جملہ اراکین نے شرکت کی۔ کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ نے تعزیتی میٹنگ میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ مخمور سعیدی کی رحلت پر جتنا نقصان اردو ادب بالخصوص شاعری اور ادبی صحافت کو ہوا ہے، اس سے کہیں زیادہ نقصان قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کو ہوا ہے، واضح رہے کہ مخمور سعیدی ایک طویل عرصے سے قومی کونسل کے ادارتی شعبے سے منسلک تھے، انھوں نے مزید کہا کہ جو جگہ مخمور سعیدی کے انتقال سے خالی ہوئی ہے اس کا پُر ہونا بہت مشکل نظر آتا ہے۔ انھوں نے کونسل کے رسالوں ماہنامہ ''اردو دنیا'' اور سہ ماہی ''فکر و تحقیق'' کو جس بلندی پر پہنچایا ہے ہم اس مقام پر ان دونوں رسالوں کو قائم رکھ سکیں تو یہ ہمارے لیے بڑی بات ہوگی، اس ضمن میں معروف شاعر و صحافی اور قومی اردو کونسل کے وائس چیئرمین جناب چندر بھان خیال نے تعزیت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ مخمور سعیدی جدید شاعری کے قافلہ سالاروں میں تھے۔ وہ جدید شاعری میں تجربوں کے نام پر بھی بے راہ روی کے شکار نہیں ہوئے۔ ان کی شاعری میں روایت کا جتنا احترام پایا جاتا ہے بالکل اسی طرح عصری تقاضوں کی عکاسی بھی بھرپور طریقے سے ہوئی ہے۔ انھوں نے مخمور سعیدی کو ایک اچھے اور بلند مرتبہ شاعر کے ساتھ ساتھ ایک بلند پایہ صحافی سے بھی تعبیر کیا۔ کیونکہ انھوں نے شاعری کے علاوہ اردو کی ادبی صحافت کو بھی ایک نیا معیار عطا کیا ہے۔ اس موقع پر دو منٹ کی خاموشی اختیار کر کے مرحوم کو خراجِ عقیدت پیش کی گئی۔

اسی طرح غالب انسٹی ٹیوٹ میں بھی دہلی کی تمام اکادمیوں اور انجمنوں کے باہمی اشتراک سے ایک تعزیتی میٹنگ کا اہتمام کیا گیا۔ جس میں دہلی کی تمام ادبی سرکاری و غیر سرکاری اداروں اور انجمنوں نے شرکت کی جو حسب ذیل ہیں: ساہتیہ اکادمی، غالب انسٹی ٹیوٹ، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، انجمن ترقی اردو، دہلی اردو اکادمی، مولانا محمد علی جوہر اکادمی، یونائیٹڈ مسلم آف انڈیا، یو ڈی او، عوامی ایکتا ویلفیئر ایسوسی ایشن، مدرسہ مصباح القرآن، مولانا آزاد ایجوکیشنل اینڈ میڈیکل آرگنائزیشن سرِ فہرست ہیں۔ مذکورہ تعزیتی نشست کی صدارت معروف ادیب و نقاد اور دانشور پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کی۔ انھوں نے اپنے صدارتی کلمات کا اظہار کرتے ہوئے مخمور سعیدی کو خراجِ عقیدت ان الفاظ میں پیش کیا۔ ''مخمور سعیدی بہترین ادیب و شاعر، نثر نگار اور صحافی تھے۔ ان میں مشرقی وضع داری اور شرافت کوٹ کوٹ کر بھری تھی جس کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔ ان کے فن اور شخصیت کو کسی طور فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ انھوں نے مزید کہا کہ مخمور سعیدی میں ایسی خوبیاں تھیں کہ ہر شخص ان کی تعریف کرتا ہے۔ آج کی دنیا میں ایسے بہت کم لوگ ہوتے ہیں جو طرف داریوں اور جانبداریوں سے بالاتر ہوں۔ مخمور سعیدی ایسی ہی شخصیت کے مالک تھے۔ وہ جتنی اچھی غزل کہتے تھے اتنی ہی اچھی نظم بھی لکھتے تھے اور نثر بھی۔ ان کی شاعری روایت اور جدیدیت کا سنگم تھی۔ غالب کی کتاب ''دستنبو'' کا معیاری ترجمہ کر کے انھوں نے اپنی فارسی دانی کا اعتراف کروایا، انھوں نے شاعری کے طور پر ہی نہیں بلکہ ادبی صحافی کے طور پر بھی اپنی حیثیت کا اعتراف کرایا۔ انھوں نے کبھی بھی اپنے اوپر کسی خاص نظریہ کا ٹھپّہ نہیں لگنے دیا۔ وہ ''ہماری زبان'' یا ''ایوانِ اردو'' میں یا پھر ''اردو دنیا'' اور ''فکر و تحقیق'' میں یا کہیں اور، ہر جگہ اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ مختلف نظریات کے درمیان رہتے ہوئے بھی اپنی انفرادیت قائم رکھی۔''

روزنامہ راشٹریہ سہارا کے گروپ اڈیٹر عزیز برنی نے تعزیتی کلمات ادا کرتے ہوئے کہا کہ مخمور سعیدی میرے بڑے بھائی کا درجہ رکھتے تھے۔ انھوں نے مزید کہا کہ کبھی ایسا وقت آتا ہے جب انسان کو ایک خالی پن محسوس ہوتا ہے یہ وہی وقت ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ مخمور سعیدی نے اردو ادب اور شاعری کی جو خدمات انجام دی ہیں اسے ادبی تاریخ کبھی فراموش نہیں کرسکتی اور آنے والی نسلیں ان سے تحریک حاصل کرتی رہیں گی۔ اس موقع پر دہلی یونیورسٹی شعبۂ اردو کے سابق صدر پروفیسر صادق نے کہا کہ مخمور سعیدی بہت ہی منکسر المزاج انسان تھے۔ انھوں نے کئی رسالوں کی ادارت کرتے ہوئے صحافت کا ایک معیار قائم کیا۔ ''دستنبو'' کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اس کا ترجمہ مخمور صاحب نے 1969 میں ہی کر لیا تھا اور اسے رسالہ ''تحریک'' کے غالب نمبر میں شائع بھی کیا تھا۔ حالانکہ بعد میں دو لوگوں نے اس ترجمہ کو اپنے نام سے شائع کرایا جو انتہائی حیرت انگیز بات تھی۔

اردو اکادمی دہلی کے قائم مقام وائس چیئرمین سید شریف الحسن نقوی نے تعزیت کرتے ہوئے کہا کہ مخمور سعیدی ایک زندہ دل انسان تھے۔ ان کا انتقال اردو ادب، صحافت اور شاعری کا بہت بڑا خسارہ ہے انھوں نے اس بات کا اعتراف بھی کیا کہ اکادمی کے جریدہ ''ایوانِ اردو'' نے ان کی ادارت میں بلندی کے مقام تک پہنچا۔

انجمنِ ترقی اردو ہند سے وابستہ ڈاکٹر اسلم پرویز نے کہا کہ مخمور سعیدی ایک خوددار انسان تھے۔ انھوں نے مخمور صاحب کی منکسر المزاجی اور اخلاق کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ نثار احمد فاروقی اور مخمور سعیدی دونوں ایسے شخص تھے جن سے

ہم بے جھجک کچھ بھی پوچھ لیا کرتے تھے۔ ان کی موت سے جو نقصان ہوا ہے اس کی تلافی بہت مشکل ہے۔ عالمی اردو ٹرسٹ کے صدر عبدالرحمن ایڈوکیٹ نے کہا کہ مخمور سعیدی بحیثیت انسان بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ وہ ایک اچھے شاعر تھے۔ جدت طرازی ان کی فطرت میں شامل تھی۔ لیکن انھوں نے کلاسیکل غزل کی روایت کو ہمیشہ برقرار رکھا۔ اس ضمن میں غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی نے کہا کہ مخمور سعیدی لوگوں کو تربیت دینے والوں میں تھے۔ ان کا کلام کلاسیکی روایات کا حامل تھا۔ وہ انسانی اقدار میں یقین رکھنے والے انسان تھے اس تعزیتی جلسے کا اہتمام قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان، ساہتیہ اکادمی، غالب انسٹی ٹیوٹ، اردو اکادمی، دہلی، عالمی اردو ٹرسٹ اور انجمن ترقی اردو (ہند) کے تعاون سے کیا گیا۔

مخمور سعیدی کے سانحۂ ارتحال پر دہلی کے علاوہ ملک کے تمام صوبوں اور شہروں کی ادبی، سماجی انجمن، ادارے، اکادمیاں اور یونیورسٹیز میں تعزیتی جلسے کا اہتمام کیا گیا۔ واضح رہے کہ مخمور سعیدی عالمی شہرت کے حامل شاعر تھے اور ان کی شہرت ملک گیر سطح کے علاوہ بیرون ممالک میں بھی تھی۔ یہ خیال رہے کہ مخمور سعیدی کا تعلق صوبہ راجستھان کے شہر ٹونک سے تھا۔ ان کی جسد خاکی کو ان کے آبائی وطن ٹونک میں ہی 3 مارچ کو سپرد خاک کیا گیا۔

مخمور صاحب کے انتقال پر صوبہ راجستھان کے وزیر اعلیٰ جناب اشوک گہلوت نے تعزیتی اجلاس میں افسوس کا اظہار کیا۔ نیز انھوں نے کہا کہ اردو زبان کی ترقی اور اردو شاعری کے فروغ میں مخمور سعیدی کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ ادبی صحافت میں بھی ان کا خاص مقام تھا اور ان کا شمار اردو ادب میں عمدہ شاعروں کی فہرست میں ہوتا ہے۔ ان کی شاعری دل کو چھو لینے والی تھی۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ مخمور سعیدی قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے آخری دم تک مشیر تھے۔ انھوں نے مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام پانے کی خواہش کا اظہار کیا اور پس ماندگان بالخصوص اہلیہ کو اس ناگہانی صدمہ کو برداشت کرنے کی خدا سے دعا کی۔

اس سلسلے میں راجستھان کے مختلف شہروں میں تعزیتی نشست کا انعقاد بھی کیا گیا۔ میڈیکل کالج جے پور میں بھی ایک تعزیتی جلسہ ہوا۔ میڈیکل کالج کے ڈائرکٹر ڈاکٹر سدھیر سچدیوا نے اپنے رنج و ملال کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ آج ملک کو ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہوا ہے۔ گنگا جمنی تہذیب و ثقافت کا ایک علمبردار آج ہم سے جدا ہو گیا۔ اسی طرح مولانا ابوالکلام آزاد عربی فارسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے کارگزار ڈائرکٹر صاحبزادہ عبدالمنان خاں نے کہا کہ بسمل سعیدی اور اختر شیرانی کی ہی کڑی کے ایک شاعر مخمور سعیدی تھے جنھوں نے پورے ملک میں ٹونک کا نام روشن کیا۔

□□□

کلیاتِ رشید احمد صدیقی جلد اوّل (آپ بیتی)

مرتب: پروفیسر ابوالکلام قاسمی

رشید احمد صدیقی اردو کے صاحب طرز نثر نگاروں میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ قومی اردو کونسل نے ان کی تمام نثری تحریروں کو کلیات کی صورت میں شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے جس میں صدیقی صاحب کی مشہور کتاب ''آشفتہ بیانی میری'' کے علاوہ وہ تمام تحریریں یکجا کردی گئی ہیں جو ان کی آپ بیتی کے ذیل میں رکھی جاسکتی ہیں۔

صفحات: 235، قیمت -/174 روپے

تبصرات ماجدی

مرتب: عبدالعلیم قدوائی

مولانا عبدالماجد دریابادی کا نام ایک عالم دین ادیب، ایک صاحب طرز انشا پرداز اور ایک صاحب نظر صحافی کی حیثیت سے کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ انھوں نے ادب، فلسفہ، سوانح، تنقید، سیرت، تفسیر، ترجمہ ہر شعبے میں ناقابل فراموش خدمات انجام دی ہیں۔ ان کا ایک بڑا کارنامہ انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں قرآن مجید کا ترجمہ اور تفسیر ہے۔ اس کتاب میں مولانا موصوف کے ادبی تبصرے یکجا کردیے گئے ہیں جنھیں پڑھ کر بیسویں صدی کے ادبی اکتسابات کا اندازہ بخوبی کیا جاسکتا ہے۔

صفحات: 472، قیمت -/277 روپے

انسانی حقوق

مصنف: خواجہ عبدالمنتقم

اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے 23 دسمبر 1994 کو یہ اعلان کیا تھا کہ یکم جنوری 1995 کو شروع ہونے والی دہائی انسانی حقوق سے متعلق تعلیم کی دہائی ہوگی اور اس مدت میں انسانی حقوق کے فروغ کے لیے کوشاں تمام اداروں، تنظیموں، ذرائع ابلاغ، وکلا اور دیگر لوگوں سے اپیل کی جائے گی کہ وہ انسانی حقوق کے بارے میں معلومات کو موثر انداز میں لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کریں۔ اس کتاب میں انسانی حقوق سے متعلق تمام ضروری اور اہم معلومات یکجا کردی گئی ہیں۔

صفحات: 497، قیمت -/430 روپے

سائنس اور راج

مصنف: دیپک کمار، مترجم: سہیل احمد فاروقی

اس کتاب میں نوآبادیاتی ماحول میں سائنس کے ارتقا، اس کے سماجی مضمرات، معاشی پیچیدگیوں اور ان سب کے ذیلی اثرات کی جستجو کی گئی ہے اور اس جستجو کے ذیل میں تکنیکی تقاضوں اور نوآبادیاتی ضرورتوں کے درمیان رشتوں کی نوعیت اور نوآبادیاتی طریقۂ کار پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ گذشتہ صدی کے ہندوستان میں تاریخ، سائنس اور حکومت کے متعلق، اس کے نشیب و فراز اور رفتار و روش کو سمجھنے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔

صفحات: 361، قیمت -/237 روپے

تبصرہ وتعارف

آزادی کے بعد اردو اسٹیج ڈرامے

مرتبہ: زبیر رضوی
صفحات: 757، قیمت: -/396 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔ 1، ونگ-6، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی

مبصر: ڈاکٹر ابوظہیر ربانی، شعبۂ اردو، دیال سنگھ کالج، لودھی روڈ، نئی دہلی-03

ڈراما دیگر فنون ادب کی طرح ایک مستقل فن ہے۔لیکن ڈراما اور دیگر فنون میں اشتراک کے باوجود بڑا فرق بھی ہے۔ یہ ایسی صنف ادب ہے جس کا تعلق قارئین سے کہیں زیادہ ناظرین سے ہے۔ڈراما میں بیانیہ اظہار کی گنجائش کم ہی رہتی ہے اس لیے کردار کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ کردار ہی افراد کے احساسات وجذبات اور تجربات ومشاہدات کو اپنے اوپر طاری کرکے اسٹیج پر ظاہر کرتے ہیں۔اسٹیج ڈرامے کی ایک شاندار روایت رہی ہے جو آج بھی قائم ہے۔زیر تبصرہ کتاب' آزادی کے بعد اردو اسٹیج ڈرامے' بارہ ایسے اسٹیج ڈراموں کا انتخاب ہے جسے زبیر رضوی نے ترتیب دیا ہے۔ڈراموں کے تعلق سے زبیر رضوی کا مطالعہ گہرا ہے۔کتاب کی ابتدا میں زبیر رضوی نے آغاز سے لے کر اب تک عہد بہ عہد اردو ڈرامے کے بدلتے منظرنامے کی معروضی اور غیر جانبدار اجمالی تاریخ پیش کی ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ مذکورہ کتاب کے ڈرامے فیشن کے طور پر نہیں بلکہ قومی تھیٹر کے بدلتے منظر نامے کے علاوہ سماجی ،سیاسی اہمیت کے حامل ہیں اور جن میں تکنیک اور اسلوب کے نئے زاویے بھی در آئے ہیں۔

پہلا ڈراما' شطرنج کے مہرے' معروف ڈراما نویس اور اداکار حبیب تنویر کا تحریر کردہ ہے۔ یہ پریم چند کا افسانہ' شطرنج کی بازی' کا ڈرامائی روپ ہے۔ پریم چند کی کہانی کو ڈراما کی شکل دینے کا مقصد یہ تھا کہ لوگ جان سکیں کہ پریم چند ایک غیر جانبدار افسانہ نگار تھے۔انھوں نے ہندو سماج کو تنقید کا نشانہ بنایا تو مسلم معاشرہ بھی ان کی تنقید سے بچ نہ سکا۔

انسانی ترقی کا انحصار اقتصادی صورت حال پر ہے۔جن میں غذائی اجناس کا مسئلہ سب سے اہم ہے۔' بھوکے بھجن نہ ہوئے گوپالا' ساگر سرحدی کا ڈراما ہے۔اس ڈرامے کے عنوان ہی سے پتہ چلتا ہے کہ بھوکے انسان کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔ پیٹ خالی ہونے کی صورت میں خدا کی یاد بھی دل سے جاتی رہتی ہے۔کسی نے سچ کہا ہے کہ'' من چنگا تو کٹھوتی میں گنگا''۔ ڈراما میں مفاد پرست حکمراں اور سرمایہ دارانہ نظام تنقید کا نشانہ بنے ہیں۔ڈراما' رات' میں جاوید صدیقی نے پولس انتظامیہ کے ظالمانہ اور نفرت انگیز سلوک کا پردہ فاش کیا ہے جہاں بغیر کسی تفتیش اور ٹھوس ثبوت کے شک وشبہ کی بنیاد پر بے قصور افراد کو ایذا پہنچائی جاتی ہے اور اسے بھوکے پیاسے رکھ کر اقبال جرم پر مجبور کیا جاتا ہے۔ڈرامے کے کردار عاشی کے ساتھ نازیبا حرکت سے عاشی کے اندر انتقام کا جذبہ بھڑک اٹھتا ہے۔رہائی کے بعد عاشی کی عزت سے کھیلنے والا اتفاق سے عاشی کے ہاتھ لگ جاتا ہے۔اس ظالم کے ساتھ عاشی وہی ظالمانہ سلوک کرتی ہے جو اس شخص نے عاشی کے ساتھ کیا تھا۔ڈراما' رات' سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ظلم کے بیج سے ظلم ہی کا پودا اگتا ہے۔شک وشبے کی بنیاد پر معصوم اور بے گناہ افراد مارے جاتے ہیں یا مصیبت کا شکار ہوتے ہیں۔اقبال مجید کا ڈراما' کتے' ایسے نظام حکومت کے خلاف ایک بھرپور طنز ہے جس میں انسان کی کوئی قدر و قیمت ہوتی ہے اور نہ مساوات کا کوئی نظم ہوتا ہے۔

ڈراما' سنہ ستاون' کا قصہ میں ڈرامہ نگار نے کانپور کی معروف طوائف عزیز النسا کو 1857 کی جنگ میں حصے داری کو موضوع بنایا ہے جس کی پاداش میں انھیں پھانسی دی گئی تھی۔کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ گولی ماری گئی تھی۔بہر حال مرد اساس معاشرہ میں آج سے غالباً ڈیڑھ سو برس پہلے نہ صرف عورت کا بلکہ ایک طوائف کا تحریک آزادی میں شامل ہونا خود ساختہ تصورات پر کاری ضرب ہے۔

'جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ جمیائی نئیں' اصغر وجاہت کا مشہور ومعروف ماسٹر پیس ڈراما ہے۔یہ سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔اس ڈرامے کی سماجی معنویت شدت سے محسوس کی جاسکتی ہے۔ڈراما تقسیم ہند پر مبنی ہے اور ان شرپسند عناصر کے خلاف ہے جو ہندو مسلم معاشرے میں پائے جاتے ہیں،جن کے لیے کھوکھلی مذہبیت ہی سب کچھ ہے۔اس ڈرامے میں یہ دکھایا گیا ہے کہ مذہب کی آڑ میں لوگ کیسے کیسے غلط کام کرتے ہیں اور مذہب کی غلط شبیہ پیش کرتے ہیں۔لیکن معاشرے میں ایسے اچھے لوگ بھی موجود ہیں جو مذہب اور سماج کی نمائندگی کرتے ہیں،اس کی بھی عکاسی ہوتی ہے۔

' غیر ضروری لوگ' کی مقبولیت کے بعد شاہد انور کا مذکورہ ڈراما' پی تھری' اپنے نفس مضمون کے اعتبار سے کافی شہرت کا حامل رہا۔ڈرامے میں Shadow enemy کی بات کی گئی ہے۔دوسری جنگ عظیم میں ہٹلر نے کہا تھا کہ ہم Pure Blood ہیں اور اسی بنیاد پر یہودیوں کو گیس چیمبر میں ماردیا۔مذکورہ ڈراما اسی پس منظر میں رقم کیا گیا ہے۔نئی نسل شناخت کے جس مسئلے سے جوجھ رہی ہے،اس کی بھی خوبصورت عکاسی ہوتی ہے۔'پی تھری' میں

شاہد انور نے یہ پیغام دیا ہے کہ کسی بھی چیز کو آنکھ بند کر کے نہیں قبول کرنا چاہیے یعنی Blind supportet کا نظریہ نہیں ہونا چاہیے۔ یہ ڈراما سیاسی جماعتوں کے لیے بھی ایک سبق ہے اور عوام کے لیے بھی جو آنکھیں بند کر کے سیاسی جماعتوں کے پیچھے بھیڑوں کی طرح بھاگتے ہیں۔

نند کشور آچاریہ کا ڈراما 'ظل سبحانی' چودھویں صدی کے اس ہندوستان کو پیش کرتا ہے جب علاالدین خلجی کی حکمرانی تھی، اس وقت بادشاہ ہی سب کچھ تھا عوام کی کوئی حیثیت نہیں کے برابر تھی۔ بادشاہ کے خلاف زبان سے ایک حرف نکالنا موت کو گلے لگاتا تھا۔ ڈرامے کو اسٹیج کرنے کا مقصد عوام میں بیداری پیدا کرنا ہے۔ ظلم وزیادتی اور ناانصافی کے خلاف اپنا ردعمل ظاہر نہ کرنے کے بجائے خاموشی اختیار کرنے اور حالات سے مصالحت کرنے والوں کو اقبال نیازی نے ڈراما 'ہم صرف کمپرومائز نہیں کرتے' میں طنز کا نشانہ بنایا ہے جو سماجی بیداری پیدا کرنے کا سبب بنتا ہے۔ دیگر ڈرامے بھی فکر و خیال کو متاثر کرتے ہیں۔

اس مجموعے میں شامل تمام ڈرامے نمائندہ ڈراموں کے زمرے میں شامل کیے جانے کے لائق ہیں۔ ہر ڈرامے کا اپنا منفرد موضوع او ر مزاج ہے۔ اس لیے اس کا مطالعہ قاری کو ایک نئے فکری افق سے آشنا کراتا ہے۔ 'آزادی کے بعد اردو اسٹیج ڈرامے' کو منظر عام پر لانے کا مقصد شاید یہ ہے کہ ادیب و فنکار کے علاوہ عام قاری بھی اسٹیج ڈرامے کی طرف متوجہ ہوں اور اردو ادب میں اس کی اہمیت و افادیت کو محسوس کریں۔

ہند—ایرانی ادبیات (چند مطالعے)

مؤلف: کبیر احمد جائسی

صفحات: 190، قیمت: -/250 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر.کے. پورم، نئی دہلی

مبصر: ڈاکٹر عاقل انصاری، اسلام باغ، شیخ سرائے، سیتاپور، (یو. پی.)

مذکورہ کتاب کبیر احمد جائسی کے دس تحقیقی مقالات کا مجموعہ ہے۔ مضمون ''ایران میری نظر میں'' کے تحت سفر ایران کی مفصل روداد شامل اشاعت ہے۔ ''مجلس ملی انجمن استادانِ فارسی ایران'' کے دعوت نامے پر موصوف نے دو ہفتے ایران میں گزارے۔ سہ روزہ سیمینار میں شرکت کی۔ یہ سفرنامہ اسی کی رپورتاژ پر مبنی ہے۔ دس مقالات میں نصف کا تعلق ہندوستان کی فارسی ادبیات سے ہے تو نصف کا ایرانی ادبیات سے۔

بالعموم ہر کتاب میں فہرست مضامین اور وجہ تصنیف کی وضاحت کے لیے مصنف یا مؤلف کا ''مقدمہ'' شامل رہتا ہے۔ پیش نظر مجموعۂ مضامین میں ان دونوں کا التزام نہیں رکھا گیا۔ قاری کو ورق گردانی کے بعد ہی مضامین کے عنوانات اور صفحات کا علم ہوتا ہے۔ کتاب کے اولین صفحات پر ڈائرکٹر قومی اردو کونسل کا پیش لفظ شامل ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ''حیات و کائنات کے مخفی عوامل کی آگہی کا نام ہی علم ہے۔'' نیز کہ ''لکھے ہوئے لفظ کی عمر بولے ہوئے لفظ سے زیادہ ہوتی ہے۔'' یہ کلمات لائق تحسین ہیں۔ قومی کونسل طبع زاد علمی کتابیں اور زندہ جاوید ادبیات کے تراجم کی اشاعت کرتی اور قارئین کو مناسب قیمت پر مہیا کراتی ہے، یہ کتاب بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔

کتاب میں شامل مقالات میں خاصا تنوع ہے۔ ''بیدل— شخصیت اور ماحول'' میں بیدل کی سخنوری کا بھی جائزہ لیا گیا ہے مزید یہ کہ ان کے صوفیانہ خیالات اور پیرانِ طریقت سے ان کی عقیدتمندی پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

''خیام از سید سلیمان ندوی پر ایک نظر'' میں ندوی صاحب کی تحریر کا تنقیدی محاکمہ کیا گیا اور کہا گیا ہے کہ 258 رباعیات پر مشتمل کلام میں صرف سولہ رباعیات مستند ہیں باقی صدیوں بعد کی الحاقی ہیں۔ ''ہند اسلامی تہذیب کے ایرانی و زردشتی عناصر'' کے ضمن میں موصوف نے درجنوں اسلامی اصطلاحاتی الفاظ کے لغوی معنی پیش کرتے ہوئے خدا، ایزد، یزدان، سروش، رستخیز، نماز، روزہ، فرشتہ، اہرمن، بہشت، دوزخ وغیرہ پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ ''دیوان حافظ ہندی'' کے تحت ان کی رباعیات اور غزلیں پیش کرتے ہوئے ان پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے۔

''آزاد ہندوستان میں فارسی زبان کے مطالعے کی اہمیت'' بنارس ہندو یونیورسٹی کے سیمینار میں پیش کیا گیا خطبہ ہے جس میں انھوں نے کہا ہے کہ ہندوستان میں فارسی زبان کا مطالعہ قومی اور تہذیبی ضرورت ہے۔ ''انشائے مومن پر ایک نظر'' میں مکتوبات مومن میں نمایاں دو متضاد اسالیب سے بحث کی گئی ہے۔ مومن کی سید احمد بریلوی سے عقیدت اور مکتوبات میں ان کے ذکر کا نہ پایا جانا جائسی صاحب کے لیے باعث استعجاب ہے۔ موصوف نے اسے سید احمد کی تحریک جہاد کی ناکامی کے تناظر میں پرکھا اور پیش کیا۔ ان کے اس بے حوالہ بیان سے اتفاق کر پانا مشکل ہے سید احمد بریلوی کی تحریک جہاد سے انگریز اور انگریزی سلطنت پوری طرح محفوظ و مامون رہی۔ حوالے کے لیے علی میاں، ندوی کی تالیف ''سیرت سید احمد شہید'' ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ ''ہزارہ اوّل ہجری میں ایران کی فارسی تفسیر نویسی'' ایران تفسیر نویسی کے بتدریج ارتقا کی تاریخ ہے۔ جو مفصل بھی ہے اور معلوماتی بھی ہے۔ فارسی میں تفسیر نویسی کا آغاز، محمد بن جریر طبری کی عربی تفسیر ''جامع البیان فی تفسیر القرآن'' کے فارسی ترجمے سے ہوا جو لفظی ترجمہ نہیں تھا۔ مفہوم کی ترجمانی کی گئی تھی متعدد تفاسیر فارسی کے مفسرین اہل سنت والجماعت کے افراد رہے۔ صرف تفسیر رازی شیعہ عالم کی تفسیر ہے۔ خواجہ عبداللہ انصاری کے نام منسوب ''کشف الاسرار وعدۃ الابرار'' ان کے عقیدت

مندرشیدالدین ابی الفضل میبدی کے اسلوب سے ہمرنگ ہے۔'' جہانگیر اور شاہ عباس کے غیر مطبوعہ خطوط'' شاہان صفویہ و مغلیہ کے باہمی مراسم پر ہے جو آپس میں قدیمی حلیف تھے۔ جہانگیر نے نامہ و تحائف شاہ عباس کی خدمت میں اور شاہ عباس نے نامہ و تحائف جہانگیر کی خدمت میں بھیجے۔ ان کے مکتوبات کے متن بے ترجمہ اوراق کی زینت ہیں۔ ترجمہ بھی دے دیا جاتا تو اچھا ہوتا۔ کتاب کا آخری مقالہ ''ایران میں آذری زبان کا مسئلہ'' ہے۔ ایران کی سرکاری زبان فارسی اور غالب اقلیت کی زبان آذری ہے جسے سرکار نے درس و تدریس سے بے دخل کرتے ہوئے مدارس میں فارسی زبان کی تعلیم کو بالجبر مسلط کیا۔ اس پر آذر بائیجانیوں میں بے چینی کا پیدا ہونا عین فطری ہے۔ گذشتہ صدی میں غیر منقسم ہندوستان بھی اردو ہندی کے لسانی تنازعے سے دوچار رہ چکا ہے۔ اس سے آذریوں کے لسانی مسائل کو سمجھنا چنداں مشکل نہیں۔

جانسی صاحب نے جن موضوعات پر قلم اٹھایا ہے ان موضوعات کے ساتھ پورا انصاف کیا ہے۔ ان کا مطالعہ عمیق، تجزیہ معتدل، نتائج حتی الامکان حتمی برآمد کیے ہیں، جہاں قیاس سے کام لیا ہے، اس کی صراحت کردی ہے۔ موصوف کا انداز بیان تدریسی ہے۔ اظہار خیال کرتے ہوئے بیچ بیچ میں ''ایک نکتہ'' بیان کرکے قاری کو تازہ دم کرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔

جانسی صاحب کی تحریر میں پتا (پتہ) طلبہ (طلبا) دکان (دوکان) جیسے کئی الفاظ نئے املے میں نظر آئے۔ پروف ریڈنگ کی طرف سے صَرف نظر کی وجہ سے کئی الفاظ کا حلیہ بگڑ گیا۔ متعدد جگہ فرض کے ض پر نقط ندارد، حاضری کے بجائے ''حاضی'' ص 15 چھپا ہے۔ ص 154 پر تحریروں کو بہ شکل ''تحریردں'' اور ص 183 پر ''مہاتما'' کو ''ہماتما'' کے روپ میں دیکھا جاسکتا ہے۔ صفحہ نمبر لکھنے کی وجہ یہ ہے کہ آئندہ ایڈیشن میں تصحیح کے لیے متن میں ان الفاظ کی تلاش میں دشواری نہ ہو۔

کتاب کا کاغذ بہترین، طباعت عمدہ، سرورق سادہ مگر جاذب نظر اور قیمت معقول ہے۔

فکر و تحقیق (سہ ماہی) جنوری تا مارچ

صفحات: 160، قیمت: -/25 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔1، ونگ-6، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی

مبصر: عبدالحق کمال، 335 ستلج ہاسٹل، جے۔ این۔ یو۔ نئی دہلی-67

زیر تبصرہ فکر و تحقیق (سہ ماہی) میں دس مضامین ہیں، یہ رسالہ اپنے تحقیقی و تنقیدی مواد، اور مضامین کی جامعیت کی وجہ سے اردو کے مقتدر رسائل میں شمار کیا جاتا ہے۔

رسالے کا پہلا مضمون حنیف نقوی کا ''دستور الفصاحت اور شعرائے اردو'' ہے، یہ مضمون سید احمد علی یکتا کی مشہور و معروف کتاب ''دستور الفصاحت'' میں ذکر کیے گئے شعرائے اردو کے فکر و فن پر مشتمل ہے۔ اس مضمون کے مطالعے سے دستور الفصاحت کی جامعیت کا پتا چلتا ہے۔ اس میں مقدمے کے طور پر اردو زبان کے آغاز، ارتقائی مراحل، مستند مراکز اور حروف تہجی سے بحث کی گئی ہے اور اس کے بعد پانچ ابواب قائم کیے گئے ہیں۔ پہلا باب فارسی صرف و نحو کے اصول و قواعد کے متعلق ہے دوسرے ابواب میں علی الترتیب اردو زبان کے قواعد و صرف و نحو کا ذکر ہے۔ دستور الفصاحت کا واحد قلمی نسخہ رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ہے۔ اس میں اکثر شعرا کا ذکر یکتا نے بڑے جامع انداز میں کیا ہے، جو چیز سب سے زیادہ اپنی جانب متوجہ کرتی ہے وہ شعرا کی شخصیات کی مرقع کشی اور ان کے مرتبہ و مقام کا تعین ہے۔ تذکرہ نگاری کی عام روایات کو مدنظر رکھ کر دیکھا جائے تو یکتا کی سیرت نگاری کے یہ نمونے اس ضمن میں ایک شاہکار کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اس کتاب کے مطالعے سے ایسا لگتا ہے کہ کسی ادب پارے کو معیار نقد پر پرکھنے کے لیے جس ذوق نظر اور ذوق صحیح کی ضرورت ہے اس سے وہ بہ خوبی واقف ہیں۔

دوسرا مضمون نواب محمد یار خاں امیر (تلمیذ قائم) شمس بدایونی کا ہے۔ ان کا تعلق دبستان رام پور سے تھا، اس طرح یہ مضمون نواب محمد یار خاں امیر کا ایک مجموعی تعارف کراتا ہے، جو اپنے زمانے کے ایک بڑے شاعر بھی تھے اور شعرا کی سرپرستی بھی کرتے تھے۔ مختلف تذکروں میں ان کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔

تیسرا مضمون محمد شرف الدین ساحل کا ''مولانا آزاد کی مذہبی فکر'' ہے، یہ مضمون مولانا کے دینی و علمی کارناموں کو پوری طرح واقف کراتا ہے۔ مولانا کو قرآن و حدیث پر کتنا عبور حاصل تھا اس سے بخوبی واقفیت ہوتی ہے، اس کا اندازہ مولانا کے ان الفاظ میں دیکھیں۔

''آپ پوچھتے ہیں کہ مغرب و مشرق کے کن دارالعلوموں میں ادنیٰ یا اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے گزارش ہے کہ الحمدللہ کسی میں نہیں البتہ رب المغربین اور رب المشرقین کی اس درس گاہ سے فیض یاب ہوں۔''

اس طرح مولانا آزاد کی مذہبی فکر کا یہ مضمون ایک اعلیٰ نمونہ پیش کرتا ہے۔ الہلال کے اجرا سے لے کر رانچی کی نظر بندی تک مولانا کی دعوت و تبلیغ میں یہی روح کارفرما تھی اور زندگی کے ہر نشیب و فراز میں قرآن و سنت ہی سے رہنمائی حاصل کرنے کا درس دیتے رہے۔

1920 سے 1927 تک کے خطبات، تقاریر اور مضامین میں ہمیں جو کچھ نظر آتا ہے اس سے لگتا ہے کہ ان کا سینہ عشق الٰہی کے نور سے روشن تھا۔ اس

طرح مولانا آزاد کا یہی آفاقی تصور ان کے فکر ونظر میں تقسیم وطن کے لیے کوئی جگہ نہیں بنا سکا اور پوری زندگی اپنی مذہبی فکر کو جلا بخشنے کا کام کیا۔

محمد آصف قادری کا مضمون ''مولانا شبلی کی مزاحمتی شاعری'' ان کی اردو شاعری میں مزاحمت کے حوالے سے تحقیقی و تجزیاتی مطالعہ پیش کرتا ہے۔ مولانا شبلی کی شاعری میں مزاحمتی رویے کن حالات میں کس ماحول میں پروان چڑھے ان کے پیچھے کون کون سے اسباب ومحرکات کارفرما تھے اس کا پتہ بخوبی ہم اس مضمون کے ذریعے لگا سکتے ہیں۔ مولانا شبلی کے مزاحمتی جذبات ان کے کلام میں بار بار ابھرتے اور مسلمانوں میں انقلابی اور مزاحمتی جذبوں کو ابھارتے ہیں۔ مثلاً 1912 میں حادثۂ کان پور کے بارے میں ان کی نظم ہنگامی اور وقتی نوعیت کی حامل ہے۔ اس نظم کے چند اشعار:

پنھائی جارہی ہیں عالمان دیں کو زنجیریں
یہ زیور سید سجادِ عالی کی وراثت ہے
یہی دس بیس اگر ہیں کشتگان خنجر اندازی
تو مجھ کو سستیِ بازوئے قاتل کی شکایت ہے
شہیدانِ وفا کے قطرۂ خوں کام آئیں گے
عروس مسجد زیبا کو افشاں کی ضرورت ہے
عجب کیا ہے جو نوخیزوں نے سب سے پہلے جانیں دیں
یہ بچے ہیں، سویرے ان کو سو جانے کی عادت ہے

بقول انور سید شبلی کی عطا یہ ہے کہ انھوں نے اپنے موضوعات کو داخلی آنچ سے پگھلانے کی سعی کی اور جذبے کی وہ لہر جو حالی اور آزاد کی شاعری میں نسبتاً مدہم ہے شبلی کی شاعری میں تیز نظر آتی ہے۔

اس طرح مزاحمتی شاعری کے حوالے سے مولانا شبلی کی شاعری ایک دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔

''اردو شاعری میں صوفیانہ افکار اور سماجی ہم آہنگی کا میلان'' شیخ عقیل احمد صاحب کا مضمون اردو شاعری کے ان بنیادی اوصاف کو پیش کرتا ہے جس کی جڑیں اردو شاعری کے ابتدائی دور میں پوری طرح پیوست تھیں۔ ہمارا ملک ہندوستان وحدت و ہم آہنگی کا عظیم ترین نمونہ ہے۔ یہاں کی سرزمین میں ہم آہنگی کی سب سے حسین تصویریں نظر آتی ہیں۔ یہاں بے شمار صوفی سنت، رشی منی پیدا ہوئے اور ان کے پیغامات کی ہی وجہ سے ہندوستان مختلف رنگوں کے پھولوں سے تعبیر کیا جاتا ہے اور یہاں کی سماجی ہم آہنگی اور مذہبی رواداری پر ہر ایک کو فخر حاصل ہے۔ شاید اسی کو محسوس کرتے ہوئے اقبال نے کہا تھا:

وحدت کی لے سنی تھی دنیا نے جس مکاں سے
میر عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

سید اطہر رضا بلگرامی کا مضمون ''ہندوستان کے رثائی ادب کے عوامی اسالیب'' سے مرثیے کی بنیادی خوبیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس صنف میں ہمیں ہندوستانی تہذیب وثقافت کی جڑیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ اس طرح سے ہندوستان میں رثائی ادب کے عوامی اسالیب کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ یہ بیش بہا ذخیرہ دھیرے دھیرے بے توجہی کا شکار ہوتا جارہا ہے۔ اس کو زندہ رکھنے کی ضرورت ہے۔ کربلا کے تمام اندوہ ناک واقعات اگر عوام تک پہنچے ہیں اور ان واقعات میں کسی طرح کی اجنبیت ہمیں محسوس نہیں ہوتی ہے تو یہ اسی صنف کی دین ہے۔

محمد یعقوب اسلم کا مضمون تمل زبان کا اخلاقی صحیفہ، (ترو کرل اور اس کے تراجم) میں تمل زبان کی اہم اردو تصنیفات کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ زبان جنوبی ہندوستان کی قدیم ترین دراوڑی زبانوں میں سے الگ ہے یہ زبان اپنی جامعیت اور اپنی شاعرانہ لطافتوں کی وجہ سے بھی ہندوستان کی کلاسیکی زبانوں میں شمار کی جاتی ہے۔ اس میں مترجمین کا مختصر تعارف بھی پیش کیا گیا ہے۔ مثلاً پروفیسر یوسف کوکن، پروفیسر عظمت اللہ سرمدی، مولانا اسمٰعیل رفیعی اور پروفیسر حسرت سہروردی، جلال مدنی اور مختار بدری وغیرہ کے مضامین اور تصنیفات وغیرہ کا ذکر بھی محمد یعقوب اسلم نے کیا ہے جس سے تمل زبان کی اردو تصنیفات کا اردو حلقوں میں مقبولیت کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔

رسالے کا ایک اہم مضمون سید مسعود حسن کا اردو رسائل کے اشاریوں کا اشاریہ ہے، یہ کتابیات اور اشاریہ حوالہ جاتی خدمات کی ایک اہم شاخ ہے۔ آج کل سب سے زیادہ اہمیت رسائل کے اشاریوں کو دی جاتی ہے۔ علم وادب کی ہر زبان کے رسائل میں کچھ نہ کچھ چھپتا رہتا ہے۔ ان میں بیشتر مضامین رسائل کے صفحات میں ہی دب کر رہ جاتے ہیں۔ کتابی صورت میں نہیں آپاتے۔ مقالہ نگار نے مختلف جامعات میں اردو کے رسائل کے اشاریوں کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ مثلاً علی گڑھ، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور پاکستانی جامعات میں تیار کیے گئے اشاریوں کی بھی فہرست تیار کی ہے۔ اس طرح سے یہ مقالہ ایک تحقیقی نوعیت کا ہے۔ اردو رسائل کے اب تک جتنے اشاریوں کا سراغ لگ سکا ہے ان تمام اشاریوں کو حوالے کے ساتھ اکٹھا کر دیا ہے۔

جریدے کا آخری مضمون سید محمد اشرف کا رنگِ گل وبوئے گل، آرٹس فیکلٹی جنرل علی گڑھ سے لیا گیا ہے۔ صاحب مضمون قرۃ العین حیدر کے بعد کی نسل کے ایک اہم فکشن نگار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ راقم الحروف نے جس طرح اپنے طالب علمی کے زمانے کے ساتھیوں کا ذکر کیا ہے۔ اس سے اس زمانے کی پوری تصویر نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔ قرۃ العین حیدر کا تعارف جس طرح اس مضمون میں کیا گیا ہے اس سے ان کی قدر وقیمت کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

مجموعی طور پر یہ فکشن کا ایک اعلیٰ نمونہ پیش کرتا ہے۔

فلک پہلو میں (شعری مجموعہ)

شاعر: خورشید اکبر

صفحات: 160، قیمت: -/250 روپے

ناشر: مکتبہ زین العابدین، آرزو منزل، شیش محل کالونی، عالم گنج، پٹنہ

مبصر: احمد کفیل، جے. این. یو، نئی دہلی

1980 کے بعد کے شاعروں میں خورشید اکبر ایک نمایاں نام ہے۔ ''فلک پہلو میں'' ان کا تیسرا شعری مجموعہ ہے، جس میں 80 غزلیں شامل ہیں۔ ارضیات کے فطری تصورات کی چھان بین اور معاملات و حالات کو اپنے مزاج میں ڈھال کر شعروں میں کس بل پیدا کرنے کے لحاظ سے خورشید اکبر اپنے ہم عصروں میں خاصے نمایاں نظر آتے ہیں۔ اس مجموعے کے بیشتر اشعار میں آگ، سورج، ستارہ، فلک، آکاش، چاند، سمندر، پانی، مٹی، ہوا، صحرا اور دشت کو لغوی اور استعاراتی دونوں سطحوں پر استعمال کیا ہے اور ہر جگہ ایک نئی کھوج نکالی ہے۔ کبھی پوری کائنات انھیں پانی ہی پانی نظر آتی ہے اور کبھی ہر طرف آگ ہی آگ سلگتی دکھائی دیتی ہے۔

اس مجموعے کی ابتدا حمدیہ غزل سے ہوئی ہے جس میں اقبال کی شوخی محسوس کی جا سکتی ہے۔ خورشید اکبر کی چیخ اور دعا بھی گنبد بے در سے مایوس لوٹ آتی ہے، تو پھر خدا سے '' آسماں تیرا ہے یا میرا'' کا شوخیانہ لہجہ اختیار کر لیتی ہے:

ناؤ تیری ہے بھنور تیرا سمندر تیرا
کوئی ساحل نہیں ڈوبا ہے دلاور تیرا

تیرے منکر بڑے آرام سے جی لیتے ہیں
خاک تو چھانتا پھرتا ہے قلندر تیرا

حمدیہ غزل کے بعد ایک ہی زمین میں دو غزلیں ہیں جن کی قرأت کیجیے تو سوال پیدا ہوتا ہے اور ذرا انداز بدل کر پڑھیے تو اسی میں جواب بھی ہے، ایسے اشعار شاعرانہ سوجھ بوجھ پر دلالت کرتے ہیں۔ ہر غزل کے کچھ اشعار ایسے ہیں جو کانٹوں کی طرح دامن تھام لیتے ہیں اور قاری کو ٹھہر کر پڑھنے پر مجبور کرتے ہیں۔ خورشید اکبر کو شعروں میں لفظی مناسبت اور معنوی وسعت پیدا کرنے کا شعور ہے۔ ذیل کے یہ اشعار دیکھیں:

شاخِ مژگاں کے پرندے ہیں یہ آنسو گویا
آب و دانہ لیے تقدیر نکل آئی ہے
خوں ابلتا ہے نکلتا ہے دھوا آنکھوں سے
دیکھ پانی کی یہ تحریر نکل آئی ہے
رات ہے، جسم ہے، بستر ہے، فلک پہلو میں
چاند نکلا ہے کہ شمشیر نکل آئی ہے

انھوں نے کچھ ایسی غزلیں بھی مجموعے میں شامل کی ہیں جن کا مزاج دوہا سے بہت قریب ہے۔ جیسے '' پانی جیسی آگ'' یا '' پون چاہیے'' جیسی مردف غزلیں۔ بعض شعروں میں '' دلت ادب'' کا احساس نمایاں ہے۔ شعری زبان اور تغزل سے انھیں اچھی واقفیت ہے۔ ہندی یا علاقائی الفاظ کو بھی خوبصورتی سے شعری پیرہن عطا کیا ہے۔ پیش رو شعرا میں ناصر کاظمی، قتیل شفائی اور شکیب جلالی کی نذر ایک ایک غزل کہی ہے جو انھی شعرا کی زمینوں میں ہے۔

کسی ادبی نظریہ اور فارمولا کے بغیر خورشید اکبر کی شاعری، شاعرانہ صنعت گری اور تخلیقی توانائی سے لبریز ہے۔ اس کے شعری کردار میں خود اعتمادی ہے۔ اس کے کردار میں زندگی کے کریہہ مناظر کو خوش رنگ بنانے کی للک ہے۔ اس دور میں جینے کے لیے معصومیت سے مفاہمت کے بجائے اپنے مزاج سے مزاحمت کا قائل ہے کیوں کہ اس کردار کو اس بات پر اعتماد کامل ہے:

یوں تو سو رنگ میں ہوتی ہے نمایاں پھر بھی
دل کے سانچے میں ذرا دیر سے ڈھلتی ہے زمیں

نئے تنقیدی مسائل اور امکانات

مصنف: کرامت علی کرامت

صفحات: 464، قیمت: -/350 روپے

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: رغبت شمیم، E-122، برہم پتر ہاسٹل، جے. این. یو، نئی دہلی-67

کرامت علی کرامت ممتاز شاعر اور منفرد نقاد ہیں۔ ان کی پانچ تنقیدی و تخلیقی تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔ ''شعاعوں کی صلیب'' اور '' شاخ صنوبر'' ان کے شعری مجموعے ہیں۔ '' آب خضر'' شعرائے اڑیسہ کا تذکرہ ہے۔ ''اضافی تنقید'' اور ''نئے تنقیدی مسائل اور امکانات'' ان کے تنقیدی مضامین کے مجموعے ہیں۔ انھوں نے کٹک سے دو ماہی جریدہ '' شاخسار'' بھی جاری کیا تھا۔ یہ جریدہ جدیدیت کا علمبردار تھا۔ اس نے اردو ادب میں صالح اور صحت مند جدیدیت کو فروغ دینے میں نمایاں کارنامہ انجام دیا۔ کرامت علی کرامت اردو میں اضافی تنقید کے بانی بھی ہیں۔ وہ شاعری کی اطلاقی تنقید میں اضافی تنقید کو تمام تنقیدی اسالیب سے بہتر تصور کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں یہ طریقۂ کار زیادہ جامع اور معروضی ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے اڑیا ادب کا اردو میں ترجمہ بھی کیا ہے۔ ان کا یہ کام اردو ادب میں اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔

زیر تبصرہ ان کا تازہ ترین تنقیدی مضامین کا مجموعہ ''نئے تنقیدی مسائل اور امکانات'' ہے۔ یہ 464 صفحات پر محیط ہے۔ اس میں 36 مضامین ہیں۔ مشمولات مضامین میں ''نئی صدی، نئے ادبی مسائل، نئے امکانات، شاعری میں معنویت کی تلاش، تخلیقیت کیا ہے، تخلیق و تنقید بحیثیت تخلیقی ادب، چند

تنقیدی معروضات، کچھ اسلوبیات کے بارے میں، ساختیات بحیثیت تنقیدی عمل، ادبی تحریک اور قیادت کا مسئلہ، روایتی اور تجریدی افسانوں کی ماہیت، اسلام اور صنف شاعری، قلم کی آزادی کا مسئلہ، اقبال اور مغربی مفکرین — ایک معروضی مطالعہ، البیئر کامیو اور فلسفۂ وجودیت، غالب، عہد غالب او رممنون دہلوی، غالب کے تخلیقی سرچشمے — ایک جائزہ، سلام سندیلوی اور اردو شاعری میں نرگسیت، آزادغزل کا منظرنامہ، آزادغزل کا محاسبہ، تم نے فراق کو دیکھا تھا، احتشام حسین یادوں کے جھروکوں سے، جوش اور قاضی نذرالاسلام، مجروح — مقبولیت کے پل صراط پر، پرویز شاہدی اور ان کے چند قابل ذکر معاصرین، منفرد لفظ شناس شاعر — فضا ابن فیضی، لفظوں کی خوشبو کا شاعر — مصور سبزواری، بسمل سعیدی کا اسلوب شاعری، علقمہ شبلی کی غزلوں کا اسلوبیاتی مطالعہ، بیکل اتساہی اور نعت گوئی کا فن، آزاد گلاٹی کا ذہنی سفر، اردو اور اڑیا کلچر کا باہمی ربط، اڑیہ میں اردو شاعری — نصف صدی کا سفر، بنگال میں اردو نثر کا ارتقا (1900 سے 1947 تک)، اڑیا شاعری — روایت سے جدیدیت تک، اڑیا گیت — تجزیہ اور امکانات، اڑیا کی لوک کہانیاں — تجزیہ اور امکانات اور اڑیا زبان کا گیان پیٹھ انعام یافتہ شاعر — ستیا کانت مہاپاتر، ہیں کرامت علی کرامت کے یہاں نظری اور اطلاقی دونوں طرح کی تنقیدات ملتی ہیں۔ وہ اپنے تنقیدی طریق کار میں متن پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ مذکورہ مضامین کے مطالعے سے احساس ہوتا ہے کہ وہ امتزاجی اور بین العلومی مطالعے سے اپنی تنقیدات میں زیادہ کام لیتے ہیں۔ ان کی تنقیدات سائنسی علوم، نفسیات، تقابلی ادبیات، لسانیات، صوتیات، اسلوبیات، شعریات اور ردِتشکیل سے ہم آمیز ہیں۔ وہ تنقید کو بھی تخلیقی ادب کے زمرے میں دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ ان کی تنقیدات سے بحث وتمحیص کے در بھی وا ہوتے ہیں۔ مختصر یہ کہ معروضیت، سلاست، توازن اور موشگافی ان کی تنقیدی ترجیحات ہیں۔ ان کی تنقیدی نگارشات اردو تنقید میں اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔

راجستھان میں اردو نثر کی ایک صدی (1857 سے 1957 تک)

مصنفہ: ڈاکٹر قمر جہاں بیگم

صفحات: 300، قیمت: -/328 روپے

ناشر: انیس کتاب گھر، میر عالم خاں مینشن، امیر گنج، ٹونک (راجستھان)

مبصر: ڈاکٹر وسیم اقبال، محلہ قاضی سرائے اوّل، نگینہ، ضلع: بجنور (یو. پی.)

ڈاکٹر قمر جہاں بیگم، صدر شعبۂ اردو، گورنمنٹ پی. جی. ڈگری کالج ٹونک، راجستھان کے ادبی حلقوں میں کسی تعارف کی محتاج نہیں، ان کے تحقیقی وتنقیدی مضامین تو اردو قارئین کی نظروں سے گزرے ہی ہوں گے مگر ان کی ایک اہم ادبی کاوش جس سے ادبی حلقے کو متعارف کرانا یہاں ہمارا مقصد ہے وہ ہے ان کا کتابی شکل میں شائع شدہ تحقیقی مقالہ بعنوان "راجستھان میں اردو نثر کی ایک صدی (1857 سے 1957 تک)" جس پر محترمہ کو ڈاکٹریٹ کی سند بھی حاصل ہوئی۔ یہ کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے جن کی تفصیل اس طرح ہے۔

باب اوّل: "راجستھان میں اردو شعروادب کے ارتقا کا ادبی پس منظر" اس باب میں مصنفہ نے ریاست جے پور، ٹونک، الور، بھرت پور، جودھپور، جھالاواڑ، کوٹا اور اجمیر کمشنری کی ادبی سرگرمیوں کی مختصر اور جامع تاریخ قلم بند کی ہے، جس سے ان ریاستوں کے سیاسی اور سماجی حالات کا بھی علم ہوتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ راجستھان کی تشکیل سے قبل یہ صوبہ راجپوتانہ کہلاتا تھا جو چھبیس چھوٹی بڑی دیسی ریاستوں اور اجمیر کمشنری پر مشتمل تھا، جن میں بیشتر ریاستیں کافی قدیم تھیں اور کچھ انگریزوں کے ہندوستان پر قابض ہوجانے کے بعد انھیں کی سرپرستی میں قائم ہوئیں، جن میں اجمیر کا علاقہ مرکزی حکومت سے وابستہ تھا۔ 1151 میں خواجہ معین الدین چشتیؒ کی آمد کے بعد سے فارسی زبان وادب کے اثرات راجستھان کی ادبی تاریخ کے پس منظر میں نمایاں نظر آتے ہیں اور انیسویں صدی کے آغاز سے اس خطے میں اردو شعروادب کی ترویج کا باقاعدہ سلسلہ شروع ہوا۔ اگرچہ اٹھارھویں صدی کے وسط میں اس خطے میں فرقۂ مہدویہ کے عقائد اور تاریخ پر فرقۂ مہدویہ کے ایک بزرگ محمد میاں غریب کی منظوم تصنیف "تاریخ غریبی" کا سراغ ملتا ہے جو 1747 سے شروع ہوکر 1752 میں مکمل ہوئی اور "تاریخ غریبی" کے بعد ریاست جے پور کے راجا پرتاپ سنگھ (1778 تا 1805) کے ریختوں کا نام بھی اس خطے میں اردو شعروادب کی تاریخ میں لیا جاسکتا ہے۔

باب دوم: "راجستھان میں انیسویں صدی کے دوران نثری رجحانات" اس باب میں مصنفہ نے ریاست جے پور، ٹونک، اجمیر کمشنری، الور، اودے پور، بھرت پور، بوندی، بیکانیر، جودھپور، جھالاواڑ، دھول پور، قرولی اور کوٹا میں انیسویں صدی کے دوران نثری رجحانات کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ مصنفہ کے نزدیک انیسویں صدی میں راجستھان میں اردو نثر نگاری کا آغاز 1811 میں عظمت اللہ نیازی دہلوی کی تصنیف "قصۂ رنگین گفتار" سے ہوا جو تلاش معاش میں راجستھان آئے اور یہاں ملازمت کے دوران انھوں نے داستان کے انداز میں ایک قصہ مرتب کیا جس کا تاریخی نام "قصۂ رنگین گفتار" رکھا۔ اس نام سے 1236ھ مطابق 1811 اخذ ہوتا ہے۔ قصۂ رنگین گفتار کی تصنیف کے بعد راجستھان کے پہلے صاحب دیوان شاعر مرزا اکبر علی بیگ گل کی تصنیف "قاطع الشرک" کا سراغ ملتا ہے جو قرآن حکیم اور احادیث کی روشنی میں شرک جیسی برائیوں کی وضاحت اور ان سے بچنے کی تلقین پر مبنی ہے۔ "قصۂ رنگین گفتار" اور "قاطع الشرک" کے بعد راجستھان میں انیسویں صدی

کے اختتام تک جن موضوعات پر نثری تصنیف وتالیف کا سلسلہ آگے بڑھا ان میں فقہ، شرع، عقائد، تصوف، سیرت، تاریخ ادب، طب، قانون اور اخلاق وغیرہ پر مشتمل تصنیف وتالیف اور تراجم کی شکل میں مختلف علاقوں کے ادیبوں کے کارنامے ملتے ہیں جن میں بہت سی کتابیں مطبوعہ اور کافی غیر مطبوعہ ہیں۔

باب سوم: ''راجستھان میں اردو کی نثری تصانیف (1900 تا 1947)'': اس باب میں مصنفہ نے انیسویں صدی کے اختتام سے تقریباً نصف بیسویں صدی تک کی نثری تصانیف کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے۔ جس میں تمام نثری اصناف مثلاً ناول، افسانہ، ڈراما، خاکہ، انشائیہ وغیرہ کو نہ صرف شامل کیا ہے بلکہ ان کا گہرائی وگیرائی سے جائزہ بھی لیا ہے۔

باب چہارم: ''راجستھان میں اردو نثر (1948 تا 1957)'': اس باب میں مصنفہ نے ہندوستان کی آزادی کے بعد ملک کے اس خطے میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا ذکر کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ ابتداً چند ریاستوں کے باہمی اشتراک سے ایک چھوٹا سا صوبہ 30 مارچ 1948 کو قائم کیا گیا جس میں (اجمیر کمشنری کو چھوڑ کر) بقیہ تمام ریاستوں کو ضم کر دیا گیا اور جو بعد کو راجستھان کے نام سے موسوم ہوا۔ جس میں سبھی 26 چھوٹی بڑی ریاستیں 26 ضلعوں میں تبدیل ہوگئیں۔ 1956 میں اجمیر کمشنری، آبو اور سروہی کا بقیہ حصہ بھی اس میں شامل ہوجانے سے موجودہ راجستھان اب 33 ضلعوں پر مشتمل ہوگیا۔ مصنفہ نے اس باب میں انھی 33 اضلاع کی ایک دہے کی نثری ادبی خدمات کا بڑی باریک بینی سے اس طرح جائزہ لیا ہے کہ جس میں راجستھان کا تشکیلی دور اور اس عہد کے عام حالات کا اردو ادب پر اثر، اور تشکیل راجستھان کے بعد مختلف موضوعات اور اصناف کو مدِنظر رکھتے ہوئے 1957 تک کی نثری تصنیفات کا بھی مکمل طور پر احاطہ ہوگیا ہے۔

باب پنجم: ''نمائندہ نثر نگار'' اس باب میں مصنفہ نے راجستھان کے تقریباً ڈھائی درجن نمائندہ نثر نگاروں، ادیبوں اور ان کی تصانیف کا ذکر حروف تہجی کے لحاظ سے کیا ہے جن کی تفصیل اس طرح ہے۔ مولانا احترام الدین شاغل عثانی، احتشام الدین شوکت عثانی، احمد علی سیماب، اساس الدین تسنیم عثانی، اصغر علی آبرو، افضل حسین ثابت، پروشوتم لال سوریہ دوج شاد، جانی بہاری لال راضی، جوالا سہائے ماتھر، دینی پرشاد بشاش، سلطان الدین مبین، مولوی سلیم الدین تسلیم، سید احمد مرتضیٰ نظر، مولوی سید شاکر حسین نقوی، عبدالرحیم سالک عزیزی، مرزا عظیم بیگ چغتائی، غلام معین الدین مفتوں کوٹوی، کرم حسین ناطق، مجاہدالدین نسیم عثانی، محمد ایوب قمر واحدی، محمد علی جویا، محمد عمران خان، محمد یاسین شہاب برنی، محمود خاں شیرانی، منظورالحسن برکاتی، مول چند چودھری، نجف علی جھجھری، مولوی نجم الغنی اور یوسف علی خاں عزیز۔ اس کے علاوہ مصنفہ نے اس باب میں راجستھان کی ان نثری تصانیف اور نثری مخطوطات کا بھی حروف تہجی کے لحاظ سے ذکر کیا ہے جو مصنفہ کو دستیاب نہ ہوسکیں اور نہ ہی ان کی کوئی تفصیل مصنفہ کے ہاتھ لگی۔

باب ششم: ''نتائج'' اس باب میں مصنفہ نے راجستھان میں اردو نثر کی ایک صدی 1857 تا 1957 کا خلاصہ پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ معدودے چند ادیبوں کے علاوہ صفِ اوّل کے نثر نگاروں کی اس صدی میں کمی نظر آتی ہے۔ بیشتر ادیبوں اور نثر نگاروں کی شہرت مقامی دائرے سے باہر نہیں نکل سکی لیکن مقامی طور پر ان کی گراں قدر تخلیقات کو نظرانداز بھی نہیں کیا جاسکتا۔ کتاب کے آخر میں فہرست کتب شائع کی گئی ہے جن سے مصنفہ نے اپنے اس گراں قدر مقالے کی تصنیف میں مدد لی ہے۔

امید کی جاتی ہے کہ قمر جہاں بیگم کی یہ ادبی کاوش نہ صرف قدر ومنزلت حاصل کرے گی بلکہ آئندہ راجستھان کی ادبی تاریخ پر کام کرنے والوں کے لیے مشعلِ راہ بھی ثابت ہوگی۔

□□□

دنیا میں ایڈس

مصنف: جعفر محمود

ایڈس ایک ایسی بیماری ہے جو ایک نئے مہلک وائرس HIV کے ذریعے پھیلتی ہے۔ ابھی تک اس بیماری کی نہ تو کوئی موثر دوا ایجاد ہوئی ہے اور نہ ہی ایسا کوئی ٹیکہ جو اس سے انسانی جسم کو محفوظ رکھ سکے۔ یہ صحت عامہ کے لیے ایک تشویشناک مسئلہ بن چکا ہے اسی لیے اس کے تئیں بیداری پیدا کرنے کی فوری ضرورت ہے۔ اس کتاب میں HIV اور ایڈس سے متعلقہ ان تمام باتوں کا احاطہ کیا گیا ہے جن کا جاننا اس خطرناک مرض سے بچنے کے لیے ضروری ہے۔

صفحات: 425، قیمت-/456 روپے

نذیر احمد یوسفی

بی بی مینڈ کی کوزکام

بی بی مینڈ کی بیمار تھی، ٹھنڈ لگ گئی تھی، کئی دنوں سے وہ کھانسی، سردی اور زکام میں مبتلا تھی، ہر وقت کی چھینکوں نے الگ ناکوں دم کر دیا تھا، جب دیکھو آچھوں آچھوں، ان دنوں موسم بھی خراب چل رہا تھا، بارش کا نیا پانی تالاب کے جمے ہوئے پانی میں مل کر ایک قسم کی بساندھ پیدا کر رہا تھا، جس سے بی بی مینڈ کی کو اور بھی پریشانی ہو رہی تھی۔

مسٹر مینڈک کو ہمدردی کی جگہ بیزاری نے گھیر رکھا تھا، وہ بی بی مینڈ کی کی چھینک کی ''آچھوں آچھوں'' سے بدمزہ سے ہو رہے تھے لیکن اسے یوں ہی تو نہیں چھوڑ تے۔ بیوی تھی وہ ان کی، آخر بی بی مینڈ کی کو حکیم صاحب کے پاس لے گئے، حکیم صاحب نے پہلے تو مسٹر مینڈک کو اطمینان دلایا کہ تشویش کی کوئی بات نہیں، موسم کی تبدیلیوں کا اثر ہے پھر بی بی مینڈ کی سے سارا حال پوچھا، کچھ دوائیاں لکھیں اور پرہیز میں: '' پانی میں تیراکی سے بچو، آرام کرو اور خوب خوب دھوپ کھاؤ'' بھی لکھ دیا۔

اب بی بی مینڈ کی کا زیادہ وقت تالاب کے کنارے دھوپ میں پڑے رہنے میں گزرتا، ایک دن اسی طرح دھوپ کی گرمی کا مزہ لیتے لیتے وہ کچھ اس طرح پاؤں ہاتھ پھیلا کر، بے دم سی ہو کر پڑ گئیں کہ اوپر اڑتی ہوئی ایک چیل نے مردہ سمجھ کر جھپٹا مارا، اور پنجوں میں دبا کر لے اُڑی، بی بی مینڈ کی کے تو ہوش اُڑ گئے، پنجہ سے نکلنے کی کوشش کی لیکن چیل نے ملنے تک نہیں دیا، جان کی خیر نہیں، بی بی مینڈ کی کو اللہ میاں یاد آ گئے — اگر چیل نے اپنی نوکیلی چونچ بی بی مینڈ کی کے نرم نرم بدن پر، ایک مرتبہ بھی مارنے کی کوشش کی تو بیمار مینڈ کی سیدھے اللہ کے گھر ہی جا پہنچے، اچانک اسے ایک چھینک آئی جسم میں زور کا جھٹکا لگا، چیل کے پنجوں کی گرفت ڈھیلی ہو گئی اور وہ بلندی سے زمین کی طرف نیچے اور نیچے گرنے لگی — یا اللہ جان بچائیو، چیل کے بے رحم پنجوں سے بچ تو گئی اب اتنی اونچائی سے خشک زمین پر گری تو مر ہی جاؤں گی — بی بی مینڈ کی نے خوف سے آنکھیں بند کر لیں اور جلدی جلدی دعاؤں میں لگ گئی۔

اللہ تعالیٰ نے کمزور اور بیمار مینڈ کی کی فریاد سن لی، وہ سات منزل اوپر کی کھلی چھت پر بنے ایک فائیو اسٹار ہوٹل کی سوئمنگ پول میں یعنی نہانے کے تالاب کے نیم گرم پانی میں آواز کے ساتھ گر پڑی، وہاں ڈھیر ساری خوبصورت خوبصورت، بڑے گھرانے کی عورتیں تیراکی کا لباس پہن کر، تیراکی کا مزہ لے رہی تھیں بی بی مینڈ کی سیدھے ایک جوان عورت کے سر پر گری، چوٹ تو آئی مگر ہلکی سی، پھر جان بچنے کی خوشی بھی تھی، اس لیے ہڑ بڑا کر غڑاپ سے پانی میں جا گھسی، ایک کہرام مچ گیا، عورتیں سوئمنگ پول کے آئینے کی طرح جھلمل کرتے پانی سے نکل نکل کر اپنے اپنے ڈریس روم میں جا گھسیں، ڈر اور خوف کے مارے باہر نکلنے پر راضی ہی نہیں ہو رہی تھیں۔

موبائل بجنے لگے، ہوٹل کے وردی پوش منیجر کو خبر ہوئی، وہ ہوٹل کے کئی ملازمین کے ساتھ آیا اور پانی میں گرنے والی آسمانی چیز کی تلاش شروع کروائی۔ بہت مشکل سے وہ لوگ بی بی مینڈ کی کو پانی میں کھوجنے میں کامیاب ہوئے لیکن وہ جب بھی پکڑنے کی کوشش کرتے، بی بی مینڈ کی ہاتھوں سے پھسل کر کہیں اور جا لگتیں، گھنٹوں لگ گئے لیکن بی بی مینڈ کی ہاتھ نہ آئی، ملازمین اس بھاگ دوڑ سے پریشان ہو گئے تھے آخر پانی کو کم کیا گیا، تب کہیں جا کر بی بی مینڈ کی ملازمین میں سے ایک کے ہاتھ لگی، غصے سے بھرے ملازم نے مٹھی میں دبا کر، سات منزل اوپر سے اور اتنے زور سے آسمان کی طرف اُچھالا کہ بی بی مینڈ کی کا نیچے آنے سے پہلے ہی کمزور بیمار دل ڈوب گیا اور وہ مردہ ہو کر سامنے کی دوسری چھت پر ٹپ سے جا گری، اس مرتبہ پھر آسمان پر اُڑتی ہوئی چیل نے موقع دیکھ کر جھپٹا مارا اور مردہ مینڈ کی کو پنجوں میں مضبوطی سے دبوچ کر کہ کہیں پھر نہ نکل بھاگے، آسمان کی سیر کرانے لگی، حکیم صاحب کی ہدایت '' پانی سے بچو'' آرام کرو اور دھوپ کھاؤ''۔ آخر موت کا سبب بن گئی —!

ہائے! بیچاری مینڈ کی —!۔

□□□

پتہ:
Urdu Darbar, Rahmania School Street, Asansol-713302, Dist Burdwan, West Bengal.

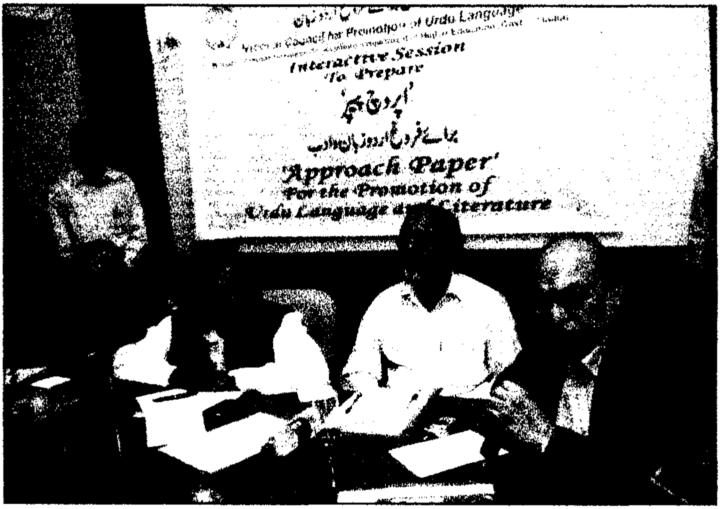

اپروچ پیپر اور کونسل کے دائرے کار پر روشنی ڈالتے پروفیسر گوپی چند نارنگ، ساتھ میں کونسل کے وائس چیئرمین جناب چندر بھان خیال، جناب کے رحمن خان (ڈپٹی چیئرمین، راجیہ سبھا) اور پروفیسر طاہر محمود کو بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

دائیں سے جناب محمد پرویز، جناب نصرت ظہیر، سید محمد اشرف، جناب اسد رضا، جناب جی. ڈی چندن، جناب معصوم مرادآبادی، پیچھے کی صف میں بیٹھے ہوئے جناب ودود ساجد، جناب پروفیسر ولی اختر، جناب خالد انور، محترمہ آبگینہ نظر اور پروفیسر شافع قدوائی۔

RNI No. 70323/99
DL-SW-16/4104/2009-11

Date of Publication : 24/03/2010
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

URDU DUNIYA Monthly, April 2010, Vol. 12, Issue: 4
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of H.R.D., Government of India

13 مارچ 2010 کو دہلی کے انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر میں قومی اردو کونسل نے اردو زبان وادب کی ترویج وترقی کے لیے "ایپروچ پیپر" تیار کرنے کے مقصد سے ایک مباحثے کا اہتمام کیا گیا۔
اس مباحثے میں ملک کی اردو زبان وادب سے وابستہ اور اردو کلچر سے منسلک مقتدر علمی، ادبی شخصیات اور ماہرین نے حصہ لیا۔ تصویر میں اوپر دائیں سے جناب چندر بھان خیال
(وائس چیئر مین قومی اردو کونسل)، جناب کے. رحمن خان (ڈپٹی چیئر مین راجیہ سبھا) جنھوں نے اس پروگرام کی قیادت کی۔ ساتھ میں جناب پروفیسر طاہر محمود اور احمد سعید ملیح آبادی۔

دائیں سے: جناب شریف الحسن نقوی (وائس چیئر مین، دہلی اردو اکادمی)، جناب عظیم اختر، جناب عارف اقبال اور ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ (ڈائرکٹر قومی اردو کونسل)۔

Printed and Published by Dr. M. Hamidullah Bhat, Director, NCPUL on behalf of NCPUL West Block-1, Wing-6, R.K. Puram, New Delhi-110066, and printed at S. Narayan & Sons, B-88, Okhla Indl. Area, Phase-II, New Delhi-110020 on 70 GSM Paper produced by TNPL Editor: Dr. M. Hamidullah Bhat, Tel: 26103381, 26103938